Title – MURAQQA RUBAIYAAT YAANI MASHAHEER SHORAY URDU KI RUBAIYON KA INTIKHAB.

Creator – Murattiba Abdullah Khan Khawaishgi

Publisher – Sudarshan Press (Khurja).

Date – 1935.

Pages – 8+24+10+38+52+26+16.

Subjects – Sawaneh Umriyaan – Hatim – Sawaneh; Sauda – Sawaneh; Hasan – Sawaneh; Dard – Sawaneh; Meer – Sawaneh; Jurrat – Sawaneh; Nazeer Akbarabadi – Sawaneh; Naseer – Sawaneh; Ismail – Sawaneh; Shaheedi – Sawaneh; Momin – Sawaneh; Zauq – Sawaneh; Sabah – Sawaneh; Naseem Dehlvi – Sawaneh; Ghalib – Sawaneh; Anees – Sawaneh; Dabeer – Sawaneh; Moannis – Sawaneh; Ishq – Sawaneh; Rasheed – Sawaneh; Awaj – Sawaneh; Meher – Sawaneh; Zaheer – Sawaneh; Falaq – Sawaneh; Rind – Sawaneh; Ameer Meenayee – Sawaneh; Daagh – Sawaneh; Majrooh – Sawaneh; Tasleem – Sawaneh; Hali – Sawaneh; Shibli – [illegible]

Intikhab Rubaiyaat; Tazkira Shora.

اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْراً

بعض بیانوں میں جادو کی تاثیر ہوتی ہے

مرقع رباعیات

یعنی

مشاہیر شعرائے اردو کی رباعیوں کا انتخاب

مرتبہ

محمد عبد اللہ خاں خویشگی گلی والہ

خلف الصدق جناب مولنا حکیم محمد عبد الرحمن خاں صاحب رئیس خورجہ

در سعد رشن پریس خورجہ طبع شد

قیمت عمہ

ہدیہ از مؤلف

بخدمت اخلاق مصدر الطاف جناب مستطاب ادیب لبیب اریب
رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ صاحب دام اقبالہم

عبداللہ
۸ فروری ۱۹۴۶ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

رباعی کی ابتدا فارسی زبان میں ہوئی، جس کی شمیم انگیزیاں ایران کے ادب پرور مرغزاروں سے نکل کر دنیا میں پھیلیں۔ عمر خیام کی رباعیاں یورپ اور امریکہ کے کتب خانوں کی زینت ہیں۔

ہماری زبان کی شاعری فارسی کا عکس مستعار ہے۔ اس لئے باغبان اول میاں ولی نے جب نونہالان نظم کی چمن بندی کی تو رباعی کے پودے کو بھی اپنی موزوں جگہ پر نصب کیا جو آہستہ آہستہ پھولتا پھلتا رہا۔ ہماری شاعری جب ترقی کے ابتدائی مدارج طے کرتی ہوئی دہلی کی محفلوں میں رونق آرا ہوئی تو شباب کی شوخیاں جھلکنے لگی تھیں۔ میر صاحب کی غزل سرائی، مرزا صاحب کی قصیدہ گوئی اور خواجہ میر صاحب کا تصوف سپہر سخن پر آسمانی روشنیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ رباعی جس طرح کہ شاعری کی ایک صنف ہے اسیطرح عام اصولوں میں اسکی تابع بھی ہے۔ چنانچہ اس عہد عروج میں اس کو بھی ترقی ہوئی۔ اور اس دور کے تمام نامور اساتذہ نے رباعیاں کہیں۔ خواجہ میر درد کا مختصر دیوان تو گویا رباعیوں ہی سے معمور ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ جب تخت تیموری کی سطوت اور شوکت کے نشان جو بابر اور اکبر نے بٹھائے مٹ رہے تھے مغل سرداروں کا ولولۂ کشور کشائی ٹھنڈا پڑ جانے سے فتحمند تلواریں زنگ آلود ہو چکی تھیں اور ہر طرف ادبار منڈلا رہا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ جفاکش قوموں کی اولوالعزمیوں کے جولانگاہ بنے ہوئے تھے۔ نئے نئے فاتح داخل ہوتے اور اپنا عمل قائم کرتے تھے۔ جنکے ہاتھوں میں نام نہاد مغل بادشاہ کٹھ پتلی بنکر رہگئے تھے۔ اور اپنی بدبختی کو دربار کی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں میں چھپانا چاہتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی ساری قوم پر بھی لہو ولعب کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ آٹھ پہر لطف ونشاط کی محفلیں گرم رہتی تھیں جنکی لامتناہی شورشوں کو کبھی ان تلواروں کی جھنکار مکدر کردیتی تھی جو دہلی کے دروازوں پر اجنبی سپاہیوں کے مابین تاج وتخت کی سیادت حاصل کرنے کے لئے چلتی رہتی تھیں۔

شاعر کے خیالات اپنی سوسائٹی اور ماحول کا پرتو ہوتے ہیں۔ پس ہماری شاعری میں قدرتاً عشق وعاشقی، حرماں وہجراں، انقلاب وعبرت، فنائے بے ثباتی غرض وہ تمام حسرت آگین اور حزن پرور مضامین داخل ہوگئے جن سے اس عہد میں ہمارے شعرا کو سابقہ پڑتا تھا۔ اور یہ ڈھنگ انگریزی تسلط قائم ہونے تک جاری رہا۔ اس زمانہ میں رباعیات کی تو فی الجملہ کمی نہیں مگر انکا عام رنگ وہی ہے جو اس دور

کی شاعری کا خاصہ ہے۔

مرثیہ گوئی بھی فارسی ہی سے ہماری زبان میں آئی۔ اگرچہ میاں مسکین میاں گدا میاں سکندر اور افسردہ کی تصنیفات زمانہ کی دستبرد سے گھس پس کر اڑ گئیں تاہم یہ ظاہر ہے کہ مرثیہ گویوں نے بھی شروع ہی سے رباعیاں کہی ہونگی مگر اس وقت اس فن کا منشا محض گریہ و بکا اور حصول ثواب تھا۔ اس لئے اس عہد کی رباعیاں بھی صرف حالات کربلا تک محدود ہوتی ہونگی۔ جب اگلا دور آیا تو بہت سی ترمیمیں اور ایجادیں اپنے ساتھ لایا۔ میر ضمیر، میر خلیق، مرزا دلگیر اور میاں فصیح نے رباعیوں کے مضامین کو بھی وسعت دی مگر پوری ترقی میر انیس اور مرزا دبیر کے ذریعہ حاصل ہوئی جنہوں نے عرفان و معرفت، موعظت و عبرت، القاب، دبیری اور عام اخلاق کے متعلق بے شمار رباعیاں کہی ہیں۔

ہماری شاعری کا موضوع گو خواہ کچھ رہا ہو مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ ادبی معیار سے اسکا پایہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ یہاں کا اعلیٰ طبقہ اردو نثر کی نوشت و خواند سے بھی ابا کرتا تھا اور تمام ملک پر فارسی انشا پردازی کا سکہ جما ہوا تھا اردو شاعری شاہراہ ترقی پر مضبوطی سے قدم بڑھا رہی تھی۔ اور اس دور میں ہماری خاک وطن سے وہ صاحب کمال اٹھے جنکے ابر قلم سے اردو لٹریچر مالا مال ہے۔

اب جب تک اس زبان کا نقش صفحہ ہستی پر قائم ہے ان اساتذہ کے

احسانات سے عہدہ برآئی نہیں ہوسکتی۔

حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہماری شاعری نے بھی کروٹ بدلی اور ایک نئی صنف نے انگریزی لائنوں پر ظہور کیا۔ سب سے پہلی مرتبہ کرنل ہالرائڈ کی تحریک پر مئی ۱۸۷۴ء میں ایک بزم سخن انگریزی شاعری کے مضامین اردو میں لانے کے لئے لاہور میں منعقد ہوئی جس میں حالی آزاد اور ارشد جیسے نامور شعرا شریک ہوکر طبع آزمائیاں کرتے تھے۔ اسکے بعد حالی نے اپنا لاجواب مسدس لکھکر قومی شاعری کی بنا ڈالی۔ یہ ایک ایسا ترش گھونٹ تھا کہ جس سے نشۂ حکومت کا خمار ٹوٹ گیا اور قوم نے اول مرتبہ اپنی پستی اور ادبار کو محسوس کیا۔ نئی گورنمنٹ نئے سروسامان کے ساتھ اپنی ایک الگ دنیا لیکر آئی۔ پس ملک کو جدید قالب میں ڈھالنے کیلئے چپہ چپہ پر رفارمر پیدا ہوئے۔ یہ اصلاح وتجدید کا دور تھا۔ رباعی کی زمین وعظ وموعظت کے لئے عین مناسب ہے اس لئے قومی رباعیوں کی ابتدا بھی اسی زمانہ میں ہوئی۔

سرسید اس وقت اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریکات کی تبلیغ کر رہے تھے۔ اُن کے موئدین کی صف اول میں خواجہ حالی کا نام آتا ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اس سلسلہ میں کثرت سے رباعیاں لکھیں جن کو ملک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی بعد میں اکبر نے اس صنف کو معراج کمال پر پہونچایا۔

زبان کی خدمت اور اس کی اشاعت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی خاص طرز کا لٹریچر مرتب کر کے شائع کیا جاوے۔ جس سے تشنہ کامان علم سیراب ہوں۔ ادب العالیہ کا ذوق بڑھے اور اپنی زبان کے نامور ارباب قلم کے مقبول پیرایۂ بیان اور بلند تخیل سے مناسبت پیدا ہو۔ اسی مقصد کو مدِ نظر رکھکر یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے۔

خواجہ حالیؔ نے کچھ شعرا کے بارے میں مشورہ دیا ہے کہ طالبانِ علم ادب ان کے کلام کا مطالعہ کیا کریں۔ جن میں اکثر اس مرقع میں جلوہ افروز ہیں نیز تبویبِ مضامین سے اندازہ ہو گا کہ ایک ہی مضمون کو ہر باکمال نے اپنے اپنے مخصوص انداز بیان میں کس طور سے ادا کیا ہے۔

اس مرقع کی ترتیب و تہذیب میں جو مشکلات درپیش آئیں اس کا اندازہ کچھ وہی خوب کر سکتے ہیں جنھوں نے ان گھاٹیوں کو عبور کیا ہے۔ بایں‌ہمہ جو کچھ ہو گیا ہے وہ قارئین کرام کے پیش نظر ہے اور جو خامیاں باقی رہ گئی ہیں اگر آیندہ ایڈیشن کی نوبت آئی تو ان کی بھی تلافی کر دی جاوے گی۔ انشاءاللہ۔

آخر میں اپنے ان تمام عزیزوں کا ممنون ہوں جنھوں نے تدوین میں کسی قسم کی امداد بہم پہونچائی ہے۔

محمد عبداللہ خاں

۵ فروری ۱۹۳۵ء — فیروز منزل۔ خورجہ

سلسلہ نمبر ۱

سوانح عمریاں
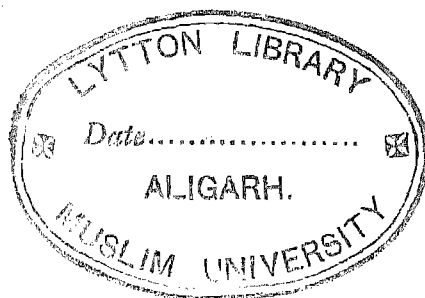
سوانح عمری

حاتم

سنہ ۱۱۱۱ھ تا سنہ ۱۱۹۶ھ

شیخ ظہور الدین نام۔ باپ کا نام فتح الدین۔ وطن دہلی۔ تخلص اول رمز تھا بعد میں حاتم اختیار کیا۔ نوجوانی میں سپاہی پیشہ اور ہر رنگ میں تھے۔ بعد میں توبہ کرکے فقیری اختیار کرلی اور اُس زمانہ کی فقیرانہ وضع میں توکل پر بسر کرتے رہے۔

سودا

سنہ ۱۱۲۵ھ تا سنہ ۱۱۹۵ھ

مرزا محمد رفیع نام اور سودا تخلص۔ پیشہ آبائی سپہ گری۔ ان کے والد مرزا محمد شفیع افغانستان سے بسلسلۂ تجارت ہندوستان آئے اور دہلی میں کابلی دروازہ کے پاس مستقل سکونت اختیار کی۔ یہیں مرزا سودا پیدا ہوئے۔ اور پرورش و تربیت پائی۔ شاہ حاتم کے شاگرد تھے مگر خان آرزو کی۔ صحبت اور توجہ سے بہت فائدے حاصل کئے۔ شاہ عالم کے عہد میں انکی شاعری کو عروج ہوا۔ جب دہلی میں ان کے قدردان اٹھ گئے تو سنہ ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ آئے۔ نواب آصف الدولہ نے علاوہ انعام و اکرام کی بارش کے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ کردیا۔ اور بڑی قدردانی کی یہیں ۷ سال کی

عمر میں انتقال کیا۔ مرزا اردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ خیالات نازک
مضامین تازہ۔ تشبیہات چست۔ بندش اعلیٰ۔ مرزا کے کلام کی خصوصیات ہیں
زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے اردو کو پاک و صاف کر کے
مقبول خاص و عام بنایا ان میں مرزا کا نمبر چوٹی پر ہے۔ تمام اصناف سخن پر
حاوی تھے۔ علی الخصوص قصائد اور ہجو گوئی میں وہ کمال دکھایا۔ کہ آج تک
دھوم ہے۔

حسن

سنہ ۱۱۴۰ھ تا سنہ ۱۲۰۱ھ

حسن تخلص۔ میر غلام حسن نام۔ میر غلام حسین ضاحک باپ کا نام۔ خواجہ
میر درد کے شاگرد تھے۔ انکے اجداد شہر ہرات کے سادات سے تھے۔ اپنے والد
میر ضاحک کے ہمراہ دہلی سے فیض آباد آئے۔ وہاں سے لکھنؤ پہونچے اور وہیں
انتقال ہوا۔ مثنوی سحر البیان آپ کی مشہور زمانہ تصنیف ہے۔

درد

سنہ ۱۱۳۳ھ تا سنہ ۱۱۹۹ھ

سید خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ باپ کا نام خواجہ محمد ناصر عندلیب۔ آباؤ اجداد
سادات بخارا سے تھے۔ خواجہ میر درد دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں تمام عمر بسر کی۔
ارباب طریقت و ارشاد سے تھے۔ شعر گوئی مستقل فن نہ تھا۔ مگر چونکہ اس زمانہ
کے اہل تصوف کے لئے شاعری لازمی تھی۔ آپ بھی شعر کہتے۔ آپ کی شاعری نے

خان آرزو کی زیر ہدایت تربیت پائی۔

درد کا کلام معنی آفرینی، سوز و گداز اور شستگی زبان میں میر کے ہم پلہ ہے اور ان کا سا تصوف تو آج تک کسی سے بھی نہیں ہوا۔ تمام عمر کسی کی ہجو نہیں کہی اور نہ کوئی قصیدہ یا مثنوی لکھی کہ یہ شاعروں کی عادت ہے۔

میر
۱۱۲۵ھ تا ۱۲۲۵ھ

میر تقی نام اور میر تخلص۔ میر عبد اللہ کے بیٹے تھے جو شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ بزرگوں کا قدیم وطن ملک دکن تھا۔ ان کے دادا اول دکن سے گجرات آئے پھر آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ والد کی وفات ہوئی تو میر صاحب خورد سال تھے۔ خانگی جھگڑوں سے رنجیدہ ہو کر دہلی میں اپنے خالو خان آرزو کے پاس چلے آئے۔ جہاں انکی شاعری نے پرورش پائی۔

شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں انکی شاعری کو عروج ہوا۔ ہندوستان کے اندر یہ بات انہی کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر انکی غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر بشہر لیجاتے تھے۔ زمانہ کی ناسازگاری سے مجبور ہو کر ۱۱۹۰ھ میں دلی چھوڑ کر لکھنؤ آئے۔ نواب آصف الدولہ نے بڑی قدردانی کی اور ۲ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور وہیں پر انتقال کیا۔

میر صاحب حد درجہ نازک مزاج تھے۔ انکی بد دماغی ضرب المثل ہے۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے مگر کیونکہ صاحب کمال تھے بادشاہ سے لیکر عوام تک

ان کی نازبرداریاں کرتے تھے۔ تمام عمر عسرت اور پریشان حالی اور مصیبت میں بسر کی اسلئے غم و درد قدرتاً ان کی شاعری کا بڑا عنصر بن گیا۔

میر صاحب بلا اختلاف اردو کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ سوز و گداز اور محاورات کی خوبی۔ زبان کی سلاست اور صفائی۔ مضامین عالی۔ اور درد و اثر میں ڈوبے ہوئے۔ نقادان سخن کی یہ رائے ہے کہ جو مرتبہ مرزا سودا کو قصیدے میں حاصل ہے۔ وہی مرتبہ میر کا غزل میں ہے۔ علی الخصوص چھوٹی بحروں میں تو وہ کمال دکھایا ہے۔ کہ جس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ جو لفظ منہ سے نکلا ہے۔ تاثیر میں ڈوبا ہوا۔

جرأت

متوفی ۱۲۲۵ھ

یحییٰ اماں نام۔ عرف شیخ قلندر بخش۔ تخلص جرأت۔ باپ کا نام حافظ اماں جو شرفائے دہلی سے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد کا قدیم وطن آگرہ مشہور ہے۔ دہلی میں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہونچے۔ جہاں بڑی مقبولیت اور قدر دانی حاصل ہوئی۔ جوانی میں نابینا ہو گئے تھے لکھنؤ میں ہی وفات پائی۔ ان کا کلام میر کے طرز میں ہے استعداد علمی بہت معمولی تھی مگر جس خوبی سے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں وہ مخصوص انہی کا حصہ ہے۔ اور ثابت کرتا ہے کہ قدرت نے ان کو شاعر پیدا کیا تھا۔
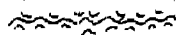
انشا

متوفی ۱۲۳۳ھ

سید انشاء اللہ خاں نام۔ انشا تخلص۔ باپ کا نام حکیم ماشاء اللہ خاں
پیشۂ آبائی طبابت۔ مرشد آباد دار السلطنت بنگال میں پیدا ہوئے۔ اور شاہ
عالم کے عہد میں دہلی آنکر تعلیم و تربیت پائی۔ استعداد علمی میں نہایت لائق
فائق تھے۔ اور متعدد زبانوں پر عبور تھا۔ شیخ مصحفی نے ان کو فیضی زماں
لکھا ہے۔ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں دلی میں شہرت پائی۔ نواب آصف الدولہ
کے عہد میں لکھنؤ پہونچے۔ جہاں بڑی قدر دانی ہوئی۔ مزاج میں چہل بہت
زیادہ تھی۔ ایک بات پر معتوب ہوکر ۱۲۲۵ھ میں خانہ نشین ہوئے۔ ان ہی
ایام میں ان کا جوان بیٹا تعالی اللہ خاں مر گیا۔ ان صدمات سے دماغ خراب
ہو گیا اور حالت دیوانگی میں انتقال کیا۔

کلام میں ہزل ابتذال اور ظرافت بہت زیادہ ہے مگر جو صاف اور سنجیدہ
ہے وہ بہترین ہے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انشا پہلے شخص
ہیں جنہوں نے اردو زبان کی صرف و نحو میں اپنی مشہور قواعد دریائے لطافت
مرتب کی۔

نظیر اکبر آبادی

متوفی ۱۲۴۶ھ

سید ولی محمد نام۔ نظیر تخلص۔ باپ کا نام محمد فاروق دہلی میں نادر شاہ

کے حملہ کے زمانہ کے قریب پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ احمد شاہ ابدالی کی چڑھائی کے وقت دلی چھوڑ کر اپنی ماں کے ساتھ آگرہ آگئے۔ اور محلہ تاج گنج میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بہت قانع اور متوکل تھے۔ جوانی میں رنگین طبع تھے۔ طویل عمر پائی اور آگرہ میں فالج میں انتقال ہوا۔

ان کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی۔ کلام نہایت سلیس اور عام پسند ہے مناظر۔ واقعات اور جذبات کی تصویر جس خوبی سے کھینچتے ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ قدرت نے ان کو حقیقی ترجمان پیدا کیا تھا۔

نصیر

متوفی ۱۲۵۴ھ

شاہ نصیر الدین نام۔ نصیر تخلص۔ باپ کا نام شاہ غریب۔ وطن دہلی۔ ذوق اور مومن ان کے نامور شاگرد ہوئے ہیں۔ عمر کا بڑا حصہ سیاحی میں بسر ہوا۔ اور حیدر آباد دکن میں بحالت سفر انتقال کیا۔

زبان اور کلام میں شکوہ الفاظی اور دقت پسندی بہت زیادہ ہے نئی نئی تشبیہیں لائے ہیں اور سمند سخن کو نہایت سنگلاخ زمینوں میں مہمیز کیا ہے۔

ناسخ

متوفی ۱۲۵۴ھ

شیخ امام بخش نام۔ ناسخ تخلص اور ایک متمول سوداگر شیخ خدا بخش خیمہ دوز

کے متبنیٰ تھے۔ اصلی باپ اور تھے۔ آباؤ اجداد کا وطن پنجاب تھا۔ ان کے والد برسم تجارت لاہور سے فیض آباد پہونچے اور یہ وہیں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔

فارسی کی تعلیم حافظ وارث علی شاہ لکھنوی سے حاصل کی اور کچھ علمائے فرنگی محل سے بھی پڑھا۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ مگر وہ کمال حاصل کیا کہ لکھنؤ بھر کے استاد اور ملک الشعرا کہلائے۔ خواجہ آتش کے ہمعصر تھے۔ اور دونوں باکمال استادوں کے معرکے گرم ہوئے۔

ان کا کلام شاعری کے ظاہری عیبوں سے پاک ہے۔ اور اس کا اس قدر اہتمام ہے۔ کہ اگرچہ کلام کی دلآویزی اور بندش کی چستی میں فرق پڑ جائے۔ مگر اصول ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ خاص مثال سے عام نتیجہ نکالنا اور ہر مضمون کو تشبیہ و تمثیل میں ادا کرنا ان کی طرز خاص ہے۔

شہیدی

متوفی ۱۲۵۶ھ

منشی کرامت علی نام۔ شہیدی تخلص۔ پیشہ ملازمت۔ نواح اودھ کے رہنے والے تھے مگر آخری عمر میں بریلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ہمراہ حج کو گئے۔ مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

کلام نہایت پختہ اور سنجیدہ ہے۔ محاورات اور تمثیلات کا استعمال نہایت

خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

مومن

سنہ ۱۲۱۵ھ تا سنہ ۱۲۶۸ھ

حکیم مومن خاں نام۔ مومن تخلص۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں۔ پیشہ طبابت۔ وطن دہلی۔ آباؤ اجداد کی اصل نجبائے کشمیر سے تھی۔

نہایت عالم فاضل ذکی اور ذہین شخص تھے۔ عربی اور فارسی میں استعداد کامل اور اکثر علوم میں مہارت تامہ تھی شاعری اور اپنے آبائی پیشے طب کی علاوہ نجوم میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ شطرنج سے بھی قدرتی لگاؤ تھا۔

رنگین طبع۔ رنگین مزاج۔ خوش وضع۔ خوش لباس تھے۔ سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال تھے اور ہر وقت انگلیوں سے انہیں کنگھی کرتے رہتے تھے۔ نوجوانی میں سید احمد صاحب بریلویؒ سے بیعت ہوئے۔ دلی میں وفات پائی اور دلی دروازہ کے باہر مینڈھیوں کے جانب غرب شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے گورستان میں مدفون ہوئے۔

ان کی نازک خیالی اور بلند پروازی تمام ملک میں مسلم ہے۔ نادر تشبیہات اور لطیف استعارات اچھوتے مضامین اور صحیح جذبات نگاری نے ان کی کلام کو اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ جیسا کلام عجیب ہے۔ ویسا ہی پڑھنا بھی عجیب تھا۔

ذوق

۱۲۰۴ھ تا ۱۲۷۱ھ

شیخ ابراہیم نام - ذوق تخلص - باپ کا نام محمد رمضان - وطن دہلی - ان کے باپ ایک غریب سپاہی تھے - اور نواب لطف علی خاں کی حویلی کی کاروبار کی خدمت سپرد تھی - ذوق نے دہلی میں تعلیم و تربیت پائی - شاعری میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے - مگر نوعمری میں استاد سے بگاڑ ہو کر تعلقات منقطع ہو گئے - انکی ہونہار طبیعت نے وہ کمال حاصل کیا کہ بیس ہی برس کی عمر میں نواب الہی بخش خاں معروف اور ولی عہد سلطنت ظفر کے استاد بن گئے - ظفر جب بادشاہ ہوئے تو انھوں نے ملک الشعرا خاقانی ہند کا خطاب دیا - جب ان کا شہرہ تمام ہندوستان میں پھیلا تو دیوان چندو لال نے انکو حیدرآباد بلوایا مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا - اور اس قلیل وظیفہ پر جو قلعہ شاہی سے ملتا تھا - توکل اور قناعت کے ساتھ دلی میں تمام عمر گذار دی -

کلام نہایت بلند اور روزمرہ نہایت شستہ ہے - انکی شاعری میں تکلف مطلق نہیں - تشبیہات استعارات اور دیگر صنائع بدائع نہایت برجستہ اور دلفریبی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں - غزلیں دردانگیز اور قصائد نہایت پرشکوہ ہیں -

صبا

متوفی ۱۲۷۱ھ

میر وزیر علی نام۔ صبا تخلص۔ باپ کا نام میر بندہ علی۔ وطن لکھنؤ۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ خواجہ آتش کے نامور شاگرد ہوئے ہیں۔ دو سَو روپیہ ماہوار نواب واجد علی شاہ کی سرکار سے اور تیس روپیہ ماہوار نواب محسن الدولہ کے یہاں وظیفہ ملتا تھا۔ گھوڑے پر سے گر کر انتقال ہوا۔

کلام میں محاورات کی چاشنی اور پھر جذبات کا سوز و گداز عجب لذت بخش ہے۔

ضمیر

متوفی ۱۲۷۲ھ

میر مظفر حسین نام۔ ضمیر تخلص۔ وطن لکھنؤ۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے وقت کے نامور مرثیہ گو اور مرزا دبیر کے اُستاد تھے۔ مگر شاگرد سے بگاڑ ہو گیا۔ میر ضمیر نے فن مرثیہ گوئی میں بہت سی ترمیمیں اور اصلاحیں کیں۔ جن کو انیس اور دبیر نے پایۂ تکمیل پر پہونچا دیا۔ زبان شستہ اور رفتہ ہے۔ کلام میں زور بندش میں چستی ہے۔ مرثیہ کو مسدس میں لکھنا اور سوز کی جگہ تحت اللفظ پڑھنا انہی کی ایجاد ہے۔

ظفر

۱۱۷۵ھ تا ۱۸۶۲ء

مرزا ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ نام۔ ظفر تخلص۔ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار تھے۔ پہلے اپنا کلام شاہ نصیر کو دکھاتے تھے۔ جب شاہ صاحب دکن چلے گئے تو ذوق کے شاگرد ہوئے۔ غدر ۵۷ء میں دہلی سے منتقل ہو کر رنگون نظر بند کر دئے گئے۔ اور وہیں وفات پائی۔

روزمرہ نہایت شستہ اور اردوئے معلی کا بہترین نمونہ ہے۔ نہایت پرگو تھے۔ چار دیوان یادگار چھوڑے۔

نسیم دہلوی

۱۲۱۴ھ تا ۱۲۸۲ھ

مرزا اصغر علی خاں نام۔ نسیم تخلص۔ نواب آغا علی خاں کے بیٹے تھے۔ وطن دہلی۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ باپ کے انتقال کے بعد خانہ جنگیوں سے مکدر ہو کر بڑے بھائی کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔ بعد کو عزیزوں نے ہر چند تقصیر معاف کرا کے واپس بلانا چاہا مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ فقر و فاقہ کی حالت میں تمام عمر لکھنؤ میں گذار دی۔

مومن کے شاگرد تھے۔ اور انہی کا اتباع کیا۔ کلام نہایت شستہ ہے اور خیال کی پاکیزگی کے ساتھ مضامین کی تازگی نہایت دلفریب ہے۔ مرزا غالب بھی ان کی غزلوں کو پسند کرتے تھے۔

غالب

۱۲۱۲ھ تا ۱۲۸۵ھ

مرزا اسد اللہ خاں نام۔ غالب تخلص۔ لقب مرزا نوشہ۔ خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ۔ باپ کا نام مرزا عبد اللہ بیگ خاں۔ پیشۂ آبا سپہ گری غالب دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی پانچ برس کے تھے۔ کہ ان کے والد ایک لڑائی میں کام آئے۔ چچا نے تعلیم و تربیت کی۔ غالب کا زمانۂ طفولیت آگرہ میں بسر ہوا۔ چودہ برس کی عمر میں عبد الصمد نامی ایک نو مسلم ایرانی سے فارسی میں کمال حاصل کیا۔ اور فی الحقیقت انکو شوق بھی فارسی ہی نظم و نثر کا تھا۔ مگر اردو پر بھی ان کے احسانات کم نہیں۔

آجکل غالب کو جو مقبولیت حاصل ہے۔ وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ انکی طبیعت میں ایجاد اور جدت پسندی بہت تھی۔ غالب کا اعلیٰ فلسفہ بلند تخیل مضمون آفرینی کے ساتھ بندش کی چستی انکے لئے اردو شعرا کی صف اول میں بہت بلند جگہ خالی کرتے ہیں۔ المختصر انکا پایہ مستغنی عن التوصیف ہے۔

انیس

۱۲۱۶ھ تا ۱۲۹۱ھ

میر ببر علی نام۔ انیس تخلص۔ باپ کا نام میر مستحسن خلیق۔ میر حسن کے نامور ترین پوتے اور خاندانی شاعر تھے۔ بزرگوں کا اصلی وطن دہلی تھا۔ میر انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ نوجوانی میں لکھنؤ آئے

اور باقی عمر اُسی جگہ بسر کی۔ البتہ سلطنت اودھ کی تباہی کے بعد متعدد مقامات کا سفر کیا اور مجلسیں پڑھیں۔ میر انیس جیسے عجیب شاعر تھے۔ اتنا ہی ان کا پڑھنا بھی لاجواب تھا۔ انکی دلکش آواز۔ متناسب قد و قامت اور صورت شکل غرض ہر بات اس کام کے لئے موزوں تھی پڑھنے سے پہلے بڑا سا آئینہ سامنے رکھکر تنہائی میں بیٹھتے اور پڑھنے کی مشق کرتے۔ مولانا ذکاء اللہ اور محمد حسین آزاد نے میر انیس کو پڑھتے دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ اپنے جادو سے سامعین کو مسحور کر رہے ہیں۔

میر انیس کا کلام سلاستِ بیان۔ خوبیٔ زبان۔ لطافت محاورہ۔ چستیٔ بندش اور حسن ادا میں جس بلند درجہ پر پہونچا ہے۔ ہماری زبان میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ڈھائی لاکھ شعر لکھے ہیں۔

دبیر

۱۲۱۸ھ تا ۱۲۹۲ھ

مرزا سلامت علی نام۔ دبیر تخلص۔ والد کا نام غلام حسین تھا۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ ان کے والد جب وقت لکھنؤ آئے تو مرزا دبیر سات برس کے تھے تعلیم و تربیت لکھنؤ میں پائی۔ مرثیہ گوئی میں میر ضمیر کے شاگرد تھے مگر چند ہی روز کے بعد بگاڑ ہو گیا۔ مرزا کا علم نہایت وسیع تھا۔ عربی فارسی کے منتہی تھے مرثیہ گوئی میں خوب شہرت پائی۔ میر انیس کے مدمقابل تھے۔ مگر ایک مرثیہ کے سوا یکجائی اور باہمی مقابلہ کا موقع تمام عمر کسی مجلس میں نہیں آیا۔ ۱۲۹۲ھ

کی حکومت کی تباہی کے بعد انھوں نے بھی متعدد مقامات کا سفر کیا۔ ۱۲۹۱ھ میں ضعف بصارت کی شکایت ہو گئی۔ واجد علی شاہ نے جو اس وقت کلکتہ میں نظر بند تھے۔ انکو اپنے پاس بلا کر علاج کرایا۔ لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ اور اپنے گھر میں مدفون ہوئے۔ انکے کلام میں شوکت الفاظ اور مضامین کا طوفانی سیلاب تو بہت زور سے بہتا ہے۔ مگر حلاوت زبان۔ معنی آفرینی اور صحیح جذبات نگاری اتنی بلند پایہ نہیں۔ مرزا دبیر پر اعتراض ہے۔ کہ بعض ضعیف روایتیں اور دلخراش مضامین ان کے قلم سے ایسے نکل گئے ہیں۔ جو اتنے بڑے اور نامور شاعر کے شایانِ شان نہیں تھے۔

بہر کیف ہماری زبان کے مشہور شاعر تھے۔ کم سے کم تین ہزار مرثیے لکھے ہیں۔ نوحوں، سلاموں اور رباعیوں کی کوئی شمار اور حد نہیں۔

مونس
متوفی ۱۲۹۲ھ

میر محمد نواب نام۔ مونس تخلص۔ میر انیس کے چھوٹے بھائی تھے فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اور میر انیس کے زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی۔ انہی کے شاگرد تھے۔ جب وہ فیض آباد سے لکھنؤ آئے۔ تو یہ ساتھ تھے۔ بہت پر گو تھے اور اچھا مرثیہ لکھتے اور دلکش انداز سے پڑھتے تھے۔ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ میر مونس کے سلام تمام ملک میں مشہور ہیں۔ زبان وہی ہے جو میر انیس کی ہے۔ لیکن تخیل میں اتنی بلندی مضمون میں اتنی معنی آفرینی اور ترکیب میں اتنی چستی نہیں۔

عشق

حسین مرزا نام ۔ عشق تخلص ۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی ۔ انیس اور دبیر کے ہمعصر تھے ۔ کلام بہت اعلیٰ درجہ کا اور بے عیب ہے ۔ مگر انیس اور دبیر کے مقابلہ میں جو سپہر نظم کے آفتاب و ماہتاب تھے یہ نہ چمک سکے اور ستارہ بن کر رہ گئے ۔ سچ پوچھو تو کلام کی عمدگی کے مقابلہ میں انکی شہرت کچھ بھی نہیں ۔ ناسخ کے شاگرد تھے ۔ مرثیہ گوئی میں جو ہر کمال دکھایا ۔

پیارے صاحب رشید

سنہ ۱۲۶۳ھ تا سنہ ۱۳۳۶ھ

سید مصطفےٰ مرزا نام ۔ رشید تخلص ۔ وطن لکھنؤ ۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی ۔ میر عشق اور میر انیس سے اصلاح لیتے تھے ۔ رشید کا روزمرہ نہایت شستہ اور بلند ہے ۔ وہ اپنے استاد میر انیس کے قدم بقدم چلتے تھے ۔ میر رشید کی رباعیاں بہت موثر اور دلچسپ ہیں ۔ مرثیے غزلیں ۔ سلام ۔ رباعیاں اور قصائد تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے ۔ مگر انکی عام شہرت بحیثیت مرثیہ گو کے زیادہ ہے ۔ مرثیہ میں انھوں نے جدید اصلاحیں کر کے ساقی نامہ اور بہاریہ کلام اضافہ کیا جس سے مرثیہ کی ادبی شان بڑھ گئی ۔

اکثر مقامات رامپور ۔ حیدرآباد ۔ کلکتہ وغیرہ کے سفر کئے ۔ ۷۴ سال کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال ہوا ۔
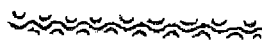
مرزا اوج

سنہ ۱۲۶۹ھ تا سنہ ۱۳۳۵ھ

مرزا محمد جعفر نام۔ اوج تخلص۔ ناموربا پ مرزا دبیر کے ناموربیٹے ہیں۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے زور کلام سے مرزا دبیر کے رنگ کو زندہ رکھا۔ حیدرآباد پٹنہ اور رامپور کے سفر کیئے۔ جہاں بڑی قدردانی ہوئی۔ مرزا اوج بہت بڑے فاضل علوم السنہ اور عروض کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک رسالہ بھی اس فن میں لکھا ہے۔ اگرچہ انکے کلام میں مرزا دبیر کے سے استعارات اور تشبیہات کا زور نہیں ہے۔ مگر سلاست زبان۔ اور دلنشین انداز بیان نے اس کمی کی بہت کچھ تلافی کردی ہے۔

مہر

سنہ ۱۲۳۰ھ تا سنہ ۱۲۹۶ھ

مرزا حاتم علی بیگ نام۔ مہر تخلص۔ باپ کا نام مرزا فیض علی بیگ تحصیلدار پیشہ آبائی ملازمت۔ وطن آگرہ۔ انکے بڑے بھائی مرزا عنایت علی بیگ ماہ بھی اچھے شاعر تھے۔ دونوں بھائی شیخ ناسخ کے شاگرد تھے۔ مہر سرکار انگریزی میں بعہدۂ منصفی سرفراز رہے۔ غدر ۵۷ء کی خیرخواہی کے صلہ میں دو گاؤں جاگیر میں ملے۔ آخر عمر میں وطن چلے آئے۔ آنریری مجسٹریٹ تھے اور وکالت کرتے تھے۔ اکثر ناموران وقت سے دوستی تھی مثلاً مرزا غالب۔ میر انیس۔ مرزا دبیر وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اردوئے معلیٰ میں غالب کے خطوط انکے نام موجود ہیں۔

کلام میں سلاست۔ روانی اور زبان پر قدرت ہے۔ ان کے اشعار صاف اور پرلطف ہوتے ہیں۔

ظہیر
متوفی ۱۹۱۱ء

سید محمد ظہیر الدین نام۔ ظہیر تخلص۔ باپ کا نام سید جلال الدین۔ وطن دہلی یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ غدر ۵۷ء کے بعد جھجر۔ سونی پت نجیب آباد بریلی اور رامپور سالہا سال آشفتہ حال پھرتے رہے۔ بالآخر دہلی لوٹے۔ کچھ دن بلند شہر کے ایک اخبار جلوۂ طور کے اڈیٹر رہے۔ پھر الور کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ وہاں سے دلی آگئے۔ اس کے بعد جے پور کی پولیس میں اچھے عہدہ پر متعین ہوگئے۔ اور پورے ۱۵ سال وہیں بسر کئے۔ جب قدرداں راجہ مر گئے تو نواب ٹونک نے بلا لیا۔ کچھ دن بعد حیدرآباد پہونچے اور وہیں انتقال ہوا۔

ظہیر اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ روزمرہ نہایت شستہ اور مضامین بلند ہیں۔ شاگرد تو ذوق کے تھے۔ مگر کلام کا رنگ مومن سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے۔

قلق

خواجہ ارشد علی خاں نام۔ قلق تخلص۔ عرف خواجہ اسد۔ ملقب بہ آفتاب الدولہ واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے مصاحب اور خواجہ

وزیر کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے۔ تلق کی مثنویاں ملک میں مشہور ہیں۔ علی الخصوص مثنوی طلسم الفت نہایت دلچسپ ہے۔

رند

نواب سید محمد خاں کا نام۔ رند تخلص۔ باپ کا نام سراج الدولہ نواب غیاث محمد خاں ۱۲۱۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ آئے۔ خواجہ حیدر علی کے نامور شاگرد ہیں۔ بمقام بمبئی انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

امیر مینائی

۱۲۴۴ھ تا ۱۳۱۸ھ

مفتی امیر احمد نام۔ امیر تخلص۔ باپ کا نام مولوی کبیر احمد۔ خاندانی سلسلہ حضرت شاہ مینا رح سے ملتا ہے جنکا مزار شریف لکھنؤ میں ہے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں تعلیم و تربیت پائی۔ عربی فارسی میں کمال دستگاہ تھی۔ میاں مظفر علی اسیر کے شاگرد تھے۔ شروع عمر میں ہی انکا شہرہ بادشاہ کے کانوں تک پہونچا۔ اور نواب واجد علی شاہ نے اپنے دربار میں بلایا۔ لکھنؤ کی تباہی کے بعد رامپور چلے گئے۔ اور نواب کلب علی خاں صاحب نے اپنا استاد بنایا۔

نواب صاحب کی وفات کے بعد جب وہاں کی سبھا اجڑی تو یہ بھی لکھنؤ آ گئے۔ چند قابل قدر علمی تصانیف کیں۔ جن میں امیر اللغات بھی شامل

ہے۔ مگر افسوس مکمل نہ ہوسکی۔ اسی کی تکمیل کے خیال سے آپ حیدرآباد دکن گئے۔ مگر وہاں ایسے بیمار ہوئے کہ پھر طبیعت نہ سنبھلی۔ اور دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔

کلام نہایت اُستادانہ شستہ اور بلند ہے۔

داغ

۱۸۳۱ء تا ۱۹۰۵ء

نواب مرزا خاں نام۔ داغ تخلص۔ باپ کا نام نواب شمس الدین خاں۔ جو نواب لوہارو کے بھائی تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے ۱۲۵۲ھ میں والد کا انتقال ہوگیا۔ انکی ماں نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر خلف بہادر شاہ کیساتھ نکاح ثانی کرلیا اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ داغ کی تعلیم و تربیت قلعہ میں ہوئی۔ ذوق کے شاگرد تھے۔ غدر ۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دہلی سے رامپور آئے جہاں اپنی عمر کے ۲۴ سال نہایت فارغ البالی سے نواب کلب علی خانصاحب کے پاس بسر کئے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد پہونچے۔ اور اعلحضرت میر محبوب علی خانصاحب کے استاد مقرر ہوئے۔ جہاں بہت بڑی تنخواہ اور بے شمار انعام و اکرام ملتا رہا۔ اور مقرب السلطان بلبل ہندوستان جہاں استاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک کا خطاب پایا۔

کلام روزمرہ اردو کی جان اور محاورات کی کان ہے۔

مجروح

۱۲۴۷ھ تا ۱۳۲۱ھ

سید مہدی نام۔ مجروح تخلص۔ باپ کا نام میر حسین فگار۔ دہلی کی ایک معزز اور علمی خاندانِ سادات کے چشم و چراغ تھے۔ اپنے خاندان میں تعلیم و تربیت پائی۔ ہنگامہ ۵۷ء کے بعد پانی پت چلے گئے اور چندے وہاں قیام کیا۔ پھر ریاست الور میں تحصیلدار ہو گئے۔ اور مسلسل ۱۴ سال تک وہاں رہے۔ جب انکے قدردان مہاراجہ شیودیال کا انتقال ہو گیا تو جے پور چلے گئے۔ وہاں سے دہلی آ گئے۔ پھر رامپور چلے گئے۔ جہاں نواب صاحب نے قدردانی اور عنایت کی جسکے باعث بفراغت زندگی بسر ہوئی۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے دہلی میں وفات پائی۔

سید مہدی مجروح غالب کے بہید عزیز اور محبوب شاگرد تھے۔ اردوئے معلی میں بہت سے خطوط انکے نام ہیں۔ مجروح کا روزمرہ نہایت شستہ اور کلام نہایت دلکش۔ سادہ۔ اور شیریں ہے۔ چھوٹی بحروں میں تو کمال دکھاتے ہیں۔ شاعری ہر قسم کے عیبوں سے بالکل پاک صاف ہے۔

تسلیم

۱۸۲۰ء تا ۱۹۱۱ء

شیخ امیر اللہ نام۔ تسلیم تخلص۔ باپ کا نام عبد الصمد۔ وطن اصلی دریاباد کی نواح میں تھا۔ مگر انکے والد ترک سکونت کر کے فیض آباد چلے آئے۔ اور

چندے قیام کیا۔ پھر لکھنؤ پہونچے۔ اور نواب صاحب کی فوج میں ملازمت کرلی۔ جب وہ سبکدوش ہوئے۔ تو باپ کی آسامی انکو ملی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب وہ پلٹن ٹوٹی تو تسلیم بھی برخاست ہوکر بیکار ہوگئے۔ مگر نواب نے ان کا وظیفہ کردیا اور شعرائے شاہی میں داخل ہوگئے۔ جب حکومت تباہ ہوئی تو یہ رامپور چلے گئے۔ وہاں سے لکھنؤ واپس آئے اور مطبع نولکشور میں ملازمت کرلی۔ ۱۸۷۵ء میں نواب کلب علی خانصاحب کی طلب پر پھر رامپور چلے گئے تھے۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد ٹونک اور منگرول میں کچھ دن رہے لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

نسیم دہلوی کے شاگرد رشید تھے اور انہی کا تتبع کرتے تھے۔ کلام نہایت سلیس اور ٹھوس ہے۔ بہت پرگو تھے اور تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انکے شاگردوں میں مولانا حسرت موہانی جیسے مایۂ ناز شاعر بھی شامل ہیں۔

حالی
۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء

خواجہ الطاف حسین نام۔ حالی تخلص۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش وطن پانی پت۔ تعلیم و تربیت دہلی میں پائی۔ اور عربی کالج میں نصاب نظامیہ کی تکمیل کی۔ حافظ قرآن اور علوم عقلی و نقلی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ابتداً چند روز جہانگیر آباد ضلع بلند شہر میں نواب مصطفےٰ خاں

شیفتہ کے پاس رہے۔ اسی زمانہ میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ وہاں سے لاہور پہونچے۔ اور تعلیمی بک ڈپو میں کام کرنے لگے جب یہ بک ڈپو لوٹا تو پھر دہلی چلے آئے۔ اور عربک اسکول میں مدرس ہوگئے۔ دلی میں انہی ایام میں سر سید مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ وہ تو قابل آدمیوں کے متلاشی رہتے ہی تھے۔ کوشش کرکے حیدر آباد کی ایک جاگیر سے وظیفہ کرا دیا جسکے بعد ملازمت سے دستکش ہوکر پانی پت چلے گئے۔ اور بقیہ عمر قوم کی خدمت اور مشغلۂ تصنیف و تالیف میں گذار دی۔

سر سید کی صحبت نے انکی طبیعت کا رنگ بالکل بدل دیا۔ جس پر عاشقانہ شاعری سے متنفر ہوکر قومی شاعری کی بنا ڈالی۔ انکے مسدس نے تمام قوم میں کھلبلی ڈالدی تھی۔ عاشقانہ شاعری میں جو فخر اور اولیت کا سہرا میر و مرزا کو حاصل ہے قومی شاعری میں خواجہ صاحب کا بھی وہی درجہ ہے۔ نظم اور نثر میں متعدد قابل قدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑ گئے۔

اسمٰعیل

۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۷ء

مولانا اسمٰعیل صاحب نام۔ وطن میرٹھ۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی علوم مروجہ میں پوری دستگاہ تھی۔ سولہ سال کی عمر میں سر رشتۂ تعلیمات میں ملازم ہوے۔ ملازمت کا زیادہ حصہ سہارنپور اور میرٹھ میں بسر ہوا۔

۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہو گئے۔ جہاں سے ۱۸۹۹ء میں سبکدوش ہو کر میرٹھ کو پنشن پر واپس آ گئے۔ اور باقی عمر تصنیف و تالیف میں بسر کی آپکی تصانیف نصاب میں عرصہ تک داخل رہی ہیں۔ گورنمنٹ سے خانصاحب کا خطاب تھا۔ مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ جدید قصر شاعری کے اولین معماروں میں شامل ہیں۔ کلام پختہ اور استادانہ ہے۔

شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء

شبلی نام۔ خطاب شمس العلماء۔ والد کا نام شیخ حبیب اللہ وکیل۔ وطن اعظم گڈھ۔ یہیں ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ پھر چند شہروں میں تعلیم حاصل کی۔ عربی علم ادب کی تکمیل لاہور جا کر مولٰنا فیض الحسن صاحب سے کی۔ حدیث کی سند سہارنپور میں مولٰنا احمد علی صاحب سے لی۔ فارغ التحصیل ہو کر وکالت کا امتحان پاس کیا۔ اور چندروز پریکٹس بھی کی۔

نوعمری میں حج کیا۔ حنفی المذہب تھے۔ اور اسی نسبت سے اپنے کو نعمانی لکھتے تھے۔ سرسید کی مردم شناس نظران پر بھی پڑی اور علی گڈھ کالج میں اپنے پاس بلا لیا۔ چندروز وہاں رہے۔ پھر وہاں سے قطع تعلق کر کے لکھنؤ میں مدرسہ ندوۃ العلماء قائم کیا۔ مولٰنا موصوف تمام علوم عقلی و نقلی کے جامع تھے۔ علی الخصوص تاریخ پر زبردست عبور رکھتا اور بڑی معرکۃ الآرا تصانیف کیں۔ آپکے علمی کمالات میں فارسی اور اردو کی شاعری بھی داخل تھی۔

اکبر

۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء

سید اکبر حسین رضوی نام۔ اکبر تخلص۔ وطن الہ آباد۔ تعلیم و تربیت قدیم مدارس اور سرکاری اسکولوں میں وطن ہی میں پائی۔ بائیس برس کی عمر میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے عدالت خفیفہ کے جج ہوے۔ اور گورنمنٹ سے خانبہادر کا خطاب ملا۔

شاعری میں میاں وحید کے شاگرد تھے۔ اگرچہ انکو شاعری کا چسکا ابتدائے عمر سے تھا لیکن پورا عروج اور عالمگیر شہرت زمانۂ پنشن یابی میں حاصل ہوئی۔ قوم کی معاشرتی۔ عمرانی۔ تعلیمی۔ اقتصادی۔ مذہبی۔ سیاسی۔ اور روزمرہ حالات غرض جملہ معاملات پر اپنے مخصوص طرز اور ناقابل التقلید اچھوتے ظریفانہ انداز میں لکھتے تھے۔ جسکو سن کر ہر ایک موافق اور مخالف پھڑک اٹھتا تھا۔ وہ فطری شاعر تھے۔ اور قوم کی طرف سے لسان العصر کا خطاب ملا تھا۔ قومی شاعری کے ابتدائی ستون ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو قابلِ رشک مقبولیت اور شہرت پائی۔ وہ کم حاصل ہوتی ہے۔

شاہ محمدی نام	مائل تخلص	وطن دہلی
منشی امداد حسین نام	صفیر تخلص	وطن لکھنؤ
سید مرتضیٰ حسن نام	بیان یزدانی تخلص	وطن میرٹھ

سلسلہ نمبر ۲

بادۂ عرفاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرقع رباعیات

حمد باری

انیس

اے خالقِ ذوالفضل و کرم رحمت کر
اے دافعِ ہر رنج و الم رحمت کر
سبقت ہے سدا غضب پہ رحمت کو تری
اپنی تجھے رحمت کی قسم رحمت کر

ایضاً

پُتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
ہے قُرب رگِ جاں سے اسیر یہ بُعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

اسمٰعیل

تقریر سے وہ فزوں، بیاں سے باہر ادراک سے وہ بری، گماں سے باہر

اندر باہر ہے وہ، نہ پیدا پنہاں ہے سرحدِ مکاں و لامکاں سے باہر

انیس

توقیر ترے ہی آستانے سے ملی عزت ترے در پہ سر جھکانے سے ملی

مال و زر و آبرو و دین و ایماں کیا کیا دولت ترے خزانے سے ملی

حالی

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور مُنکر بھی پکار اُٹھتے ہیں تجھکو مجبور

خفاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ خورشید کا شعشعہ میں پھیلا جب نور

مجروح

جو ہے سو ہے پست سب سے عالی تو ہے شایانِ صفاتِ ذوالجلالی تو ہے

ناقص ہے ہر اک کمال تیرے آگے سب کو ہے زوال، لایزالی تو ہے

اسمٰعیل

خاکِ نمناک اور تابندہ نجوم ہیں ایک ہی قانون کے یکسر محکوم

یکسانیٔ قانون کہے دیتی ہے لاریب کہ ہے ایک ہی ربِّ قیوم

بیان یزدانی

دکھلا دیے قدرت کے نمونے تو نے موتی دئے بادلوں سے ڈھلے تو نے

سب جانِ جہاں، کلام و زباں، نطق و بیاں بخشے مجھے، اے کریم تو نے! تو نے!

صفیر

دنیا کو عجیب سمتہ پایا ہم نے
حیراں ہیں کہ کیا آکے کمایا ہم نے
دم یادِ خدا میں کوئی گذرا جو صفیر
کام آیا وہی سب اور گنوایا ہم نے

انیس

دولت کی نہ خواہش ہے نہ زر چاہتے ہیں
نہ مال نہ اسباب نہ گھر چاہتے ہیں
جو مزرعہ آخرت ہے وہ خشک نہ ہو
ہاں اک تری رحمت کی نظر چاہتے ہیں

ایضاً

راہی طرفِ عالم بالا ہوں میں
دنیا سے عدم کو جانیوالا ہوں میں
یارب ترا نامِ پاک جپنے کے لئے
گویا اک ہڈیوں کی مالا ہوں میں

مجروح

رُھبان کا قسیس کا محبوب ہے تو
اور برہمن و شیخ کا مطلوب ہے تو
ہوں اہلِ کنشت یا کہ اہلِ مسجد
ہر رنگ کے طالبوں کا مطلوب ہے تو

انشا

زُہاد جو ہیں ہے انھیں طاعت پہ گھمنڈ
اور اہلِ دول رکھے ہیں دولت پہ گھمنڈ
واثق ہوں نہ طاعت سے نہ دولت سے میں
ہاں مجکو گر ہے تری رحمت پہ گھمنڈ

انیس

سب سے اول ہے سب سے سابق ہے وہی
حمد و صفت و ثنا کے لائق ہے وہی
درویش نہ محروم نہ منعم بے فیض
چیونٹی کا بھی عنقا کا بھی رازق ہے وہی

حالی

طوفاں میں ہے جب جہاز چکر کھاتا — جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا — واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

ایضاً

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا — حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو جانا ہے ضرور — بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

مائل

کعبہ میں بھی ہم نے اُسے جاتے دیکھا — اور دیر میں ناقوس بجاتے دیکھا
شامل ہے یہ ہفتاد و دو ملت مائل — ہر رنگ میں پانی سا سماتے دیکھا

میر

کیسا احسان ہے خلقِ عالم کرنا — پھر عالمِ ہستی میں مکرم کرنا
تھا کارِ کرم، اے کریمِ مطلق — ناچیز کفِ خاک کو آدم کرنا

ذوق

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا — ہم کیا ہیں کوئی کام جو ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے — جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

انیس

گذرے ہر دم مرا ارادت میں تری — گردن یہ جھکی رہے عبادت میں تری
یارب مجھے طولِ عمر دے تو لیکن — وہ عمر جو کام آئے اطاعت میں تری

انیس

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں — یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے — حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

ایضاً

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

ایضاً

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری — افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کر، کہ دوزخ میں جلا — وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

حالی

مایوسی دلوں پہ جبکہ چھا جاتی ہے — دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سکھ میں بھول جائیں اطفال — لیکن انھیں دکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

ایضاً

مٹی سے، ہوا سے، آتش و آب سے یاں — کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پُر ہیں ترے خزانے ازل سے اب تک — گنجینۂ غیب میں اسی طرح نہاں

ظہیر

محتاج کو رزق و آب تو دیتا ہے — بیتاب کو صبر و تاب تو دیتا ہے
یارب نہیں کچھ تیرے خزانے میں کمی — دیتا ہے ثواب بے حساب تو دیتا ہے

انیس

ممکن نہیں عبد سے عبادت تیری خُلق و کرم و عطا ہے عادت تیری
صحرا صحرا ہیں گو کہ عصیاں میرے دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

حالی

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا آتش پہ مُغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

جرأت

ہے مہر میں تیری ہی ضیا وقت پگاہ روشن ہے تجھی سے شام کو چرخ پہ ماہ
ہر گُل میں تری ہی بو ہے اے گلشن حُسن جب سب میں سمایا ہے تو اللہ اللہ

قلق

یارب تیری وہ فیض رساں ہے درگاہ پھرتا نہیں محروم کوئی حاجت خواہ
غیروں سے کروں سوال تیرے ہوتے لا حول و لا قوۃ الا باللہ

دبیر

یارب خلاق ماہ و ماہی تو ہے بخشندۂ تاج و تخت شاہی تو ہے
بے منت و سوال و بے استحقاق دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تو ہے

ظہیر

یارب زر و جان و مال تو دیتا ہے علم و خرد و جمال تو دیتا ہے
کچھ کسب و تلاش پر نہیں ہے موقوف دیتا ہے جسے کمال تو دیتا ہے

نعت

دبیر

آدم نے شرف خیرِ بشر سے پایا   ایمان کے رشتہ کو اس گھر سے پایا
دو میمِ محمدؐ سے جہاں ہے روشن   مضموں یہ دلِ شمس و قمر سے پایا

انیس

ایک ایک قدم لغزشِ مستانہ ہے   گلزارِ بہشت اپنا میخانہ ہے
سرمست ہیں حُبِّ ساقیٔ کوثر سے   آنکھیں شیشے ہیں قلب پیمانہ ہے

حالی

بُطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف   یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر   آبا کو بھی ہے تیری ابوّت پہ شرف

ایضاً

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا   اور اُمیوں کو خیرِ اُمم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تاتار   بچھڑے ہوئے گلّہ کو بہم تو نے کیا

دبیر

بندوں سے پیامِ احدِ پاک کہا   معبودِ ازل سے ماعبدناک کہا
دیکھی جو بنی کی خاکساری رب نے   لولاک لما خلقت الافلاک کہا

میر

پیغمبرِ حق! کہ حق دکھایا اُس کا   معراج ہے کمترین پایا اس کا
سایہ جو نہ تھا اس کا یہ باعث ہے میر   کل حشر کو سب پہ ہوگا سایا اس کا

انیس

دنیا میں محمدؐ سا شہنشاہ نہیں   کس راز سے خالق کے یہ آگاہ نہیں
باریک ہے ذکرِ قربِ معراجِ رسول   خاموش! کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں

دبیر

رف رف پہ عجب لطفِ سواری دیکھا   معراج ہوئی جمالِ باری دیکھا
نہ قلزمِ گردوں کے گئے پار نبی   گھر آکے وضو کا آبِ جاری دیکھا

حالی

زہاد کو تو نے محوِ تمہید کیا   عشاق کو مستِ لذتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی   توحید کو تو نے آکے توحید کیا

انیس

ساحل پہ ابھی تھا کہ اُدھر جا اُترا   نہ شرع چڑھی کوئی نہ پردا اُترا
تھا کشتیٔ احمد سے علاقہ جس کو   دریا سے سلامت وہی بیڑا اُترا

دبیر

طے جادۂ حق پائے سبک رَو سے کیا   ہر ذرہ کو مہرِ رُخ کے پرتَو سے کیا
انگشتِ نبی بدر میں تھی مثلِ ہلال   دو ٹکڑے قمر کو اس مہِ نَو سے کیا

مجروح

کامل جو ہوئے ان میں اکمل وہ ہے فاضل ہیں رسول لیک افضل وہ ہے
تھا اس کا ظہور پیش از آدم آخر جو ہوا ہے سب سے اول وہ ہے

قلق

کیا عرش درِ پاک سے ہو ہمپایہ آگے ترے محتاج ہے ہر ذی مایہ
اے ظلِ خدا سایہ ترا کیا ہوتا سایہ کا کبھی دیکھا ہے کسی نے سایہ

دبیر

سایہ جو پیمبر کے نہ ہمراہ رہا یہ ظلِ خدا میں یہ شہنشاہ رہا
تھا نام کو سر پہ ابر اس پردے میں محبوب کے ساتھ ساتھ اللہ رہا

ایضاً

مداح ہوا مور دِ امدادِ رسول کھولا درِ مدح، کرم دوا دِ رسول
حلالِ مہم، سرورِ کل، مالکِ ملک واللہ! رسول اور اولادِ رسول

ایضاً

موسیٰ کو تو حکم خلع نعلین ملا احمد کو مقامِ قابَ قوسین ملا
معراج کو یہاں عرشِ معلیٰ، وہاں طور کیا فرقِ بلند و پست، مابین ملا

مونس

مولا یہ ظہور سب ہے دم کا تیرے خورشید نشان ہے قدم کا تیرے
کہتے ہیں بہشتی جسے حوضِ کوثر ایک قطرہ ہے دریائے کرم کا تیرے

مجروح

واصف ترا اے صاحبِ معراج ہوں میں — کیوں مدح سرا و ثنا خواں محتاج ہوں میں
کیا حال کروں عرض ہے اتنا کافی — جتنے کہ غنی ہیں آپ محتاج ہوں میں

ظہیر

ہر شے میں کمالِ کبریا کو پایا — شہ رگ سے قریب تر خدا کو پایا
بے مثل و نظیر دیکھی ذاتِ مطلق — اور بعد خدا کے مصطفیٰ کو پایا

دبیر

ہر قلعہ کو خالق کے ولی نے کھولا — ہر عقدہ رسولِ عربی نے کھولا
مولا تھے زمیں پہ، وہ فلک پر لیکن — قفلِ قمر انگلی سے نبی نے کھولا

ظہیر

ہو کس سے ثنائے شاہِ لولاک — عاجز ہیں بشر کے فہم و ادراک
اللہ کے قول پر ہے اتمامِ کلام — لولاک لما خلقت الافلاک

دبیر

یٰسین کو سن کر جو قضا کرتے ہیں — اخلاصِ نبی کا حق ادا کرتے ہیں
یٰسین ہے نبی کا نام سو نزع کے وقت — اس نام پہ جاں اپنی فدا کرتے ہیں

سلسلہ نمبر ۳

درس قومی

قومی جذبات

حالی

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان اولاد کو سستی پہ قناعت کا گماں
بچے آوارہ، بیکار جواں ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہماں

اکبر

آگاہ ہوں معنیٔ خوش اقبالی سے واقف ہوں بنائے رتبۂ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اکبر چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

اسمٰعیل

اب قوم کی جو رسم ہے اس کا اول جلول فاسد ہوئے قاعدے تو بگڑے معمول
ہے عید مہذب نہ محرم معقول ہنسنا محمود ہے نہ رونا مقبول

حالی

اسباب پر گر نظم جہاں کا ہے مدار اس قوم کا جیتنا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں ہے جس کو ہرگز پروا ذلت سے نہیں ہے جس کو ہرگز کچھ عار

اکبر

اسباب طرب یہاں وہاں سے لائیں ہر طرح کا فرنیچر دوکاں سے لائیں
قائم نہ رہے ادب تو کیا اس کا علاج انگریز کا رعب ہم کہاں سے لائیں

اکبر

اس قوم کو یک دلی رغبت ہی نہیں
ایمان کہاں اکہ جب بصیرت ہی نہیں
طرزِ تعلیم پر ہے لیکن الزام
وہ علم نہیں تو وہ طبیعت ہی نہیں

اسمٰعیل

اسلاف کا حصہ تھا اگر نام و نمود
پڑھتے پھر واب ان کے مزاروں پہ درود
کچھ ہاتھ میں نقدِ رائج الوقت بھی ہے
یا اتنی ہی پونجی پدرم سلطاں بود

اکبر

اسلام ہی کو آپ اپنی ملت سمجھو
بیگانہ روش میں اپنی ذلت سمجھو
جو اس کے خلاف رائے رکھے اکبر
خاموش رہو اسے سمجھ کی قلت سمجھو

ایضاً

انساں نہیں گر یٹ، ہونا اچھا
دل ہونا برا ہے پیٹ ہونا اچھا
پنڈت ہو کہ ہو مولوی دونوں بیکار
انساں کو گر یجو یٹ ہونا اچھا

حالی

اک گبر نے پوچھے جو اصولِ اسلام
واعظ نے درشتی سے کیا اس سے کلام
بولا کہ حضور معتقد ہوں جس کے
ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

اکبر

اندازِ سلف کو یک قلم بھولی قوم
ہے سالکِ راہِ غیر معمولی قوم
جمعیتِ دین و دل سے کچھ کام نہیں
قومی اسکول ہے اور اسکولی قوم

اکبر

انساں وہ جو بہت سے دلوں کو ملا سکے — یا کوئی شے مفیدِ خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا — پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

ایضاً

انگریز خوش ہے مالکِ ایروپلین ہے — ہندو مگن ہے اس کا ٹرالین دین ہے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول میں پول اور خدا کا نام — بسکٹ کا صرف چورا ہے لمنڈ کا پھین ہے

ایضاً

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم — گویا کہ شبیں بہت ہیں، اور روز ہیں کم
ہر چرب زباں نہیں ہے شمعِ اخلاص — جلنے والے بہت ہیں، دل سوز ہیں کم

ایضاً

اولاد مرزا ہر طرف بدنام ہیں — ننگ بُدّھو وارثِ اسلام ہیں
گردشِ گردوں کے آگے کس کا زور — کون دم مارے خدا کے کام ہیں

ایضاً

اے جدِّ بزرگوار کے نواسو! پوتو! — تر زمیں کو تہ کرو، زمین کو جو تو
کیا رٹتے ہو اپنی ہنرمندی کو ہر وقت — اللہ مدد کرے گا ویسے ہو تو

حالی

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال — غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب سے خزانے مفتوح — جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

حالی

اے عیش و طرب تو نے جہاں میں راج کیا   سلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل   بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

اکبر

ایک شاعری وہ ہے جسے فطرت سے میل ہے   ایک شاعری وہ ہے جو اکھاڑے کا کھیل ہے
دونوں ہیں گو کہ اپنی جگہ مستحق داد   منزل سے اس کو کام ہے اسکو کلیل ہے

حالی

اے وقت لگاڑ کا ہے سب کے چارا   پر تجھسے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی   پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

اکبر

ایک سید کیا کریں آیا بیٹھ کر وس کیا کریں   حضرت حالی کے اشعار مسدس کیا کریں
سچ تو یہ ہے مہربانی آپ کی درکار ہے   ہم غریب و ناتوان و زار و بیکس کیا کریں

ایضاً

باتیں ہرگز خلاف عزت نہ کرو   دم بھر میں شرارت و لبغاوت نہ کرو
بدنام کرو نہ وضع انگریزی کو   پتلون پہن کے ترک طاعت نہ کرو

ایضاً

باز آئیں گے نہ پولیٹیکل اسٹرگل سے   جب کچھ نہیں تو لاگ لگائیں گے لیگ سے
اک شغل زندگی ہے، بہار نمود ہے   منظور دشمنی نہیں اپنے کلیگ سے

اکبر

بعد مُردن کچھ نہیں، یہ فلسفہ مردود ہے ۔۔۔ قوم ہی کو دیکھئے مُردہ ہے اور موجود ہے
شیخِ کالج، چاہئے دیندار اور صاحب اثر ۔۔۔ ورنہ کیسا ہی ہو عمدہ کورس، وہ بے سود ہے

ایضاً

بل کھاؤ ہزار، خواہ چھانٹو منطق ۔۔۔ نیچر تو ہے اپنی اصل ہی پر عاشق
لکھی ہے صحیح اک فرنگی نے یہ بات ۔۔۔ مغرب مغرب ہے، اور مشرق مشرق

ایضاً

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو ۔۔۔ بس خدا سمجھا ہے اُسنے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائیگی اک دن اور اُڑ جائیگی بھاپ ۔۔۔ دیکھنا اکبر! بچائے رکھنا اپنے آپ کو

ایضاً

بے ہنر ہو کر جو بیٹھو طعنۂ حالی سنو ۔۔۔ باہنر ہو کر جو چمکو قوم سے گالی سنو
ہم کو تو پیرِ طریقت نے یہی دی ہے صلاح ۔۔۔ قصۂ منصور دیکھو اور قوالی سنو

حالی

پاتے ہیں زبوں جو حالِ اہلِ اسلام ۔۔۔ اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوام تمام
بد پرہیزی سے بگڑے اپنی بیمار ۔۔۔ اور مفت میں ہو گیا مسیحا بدنام

اسمٰعیل

پانی میں ہے آگ کا لگانا دشوار ۔۔۔ بہتے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار سہی، مگر نہ اتنا، جتنا ۔۔۔ بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

حالی

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اکبر

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لے کر
بنیا بیٹھا ہے موٹھ موتھی لے کر
سودا اس کو ہے جو سدھار النسدن
وہ دولت و جنس گھر میں جوتھی لے کر

ایضاً

پورا سائنس تم کو آنے کا نہیں
کچھ آیا تو پیشوا بنانے کا نہیں
وہ کپنیاں ہیں اور نہ کوے کی وہ کال
بے ختم ہوئے یہ دور جانے کا نہیں

ایضاً

پہلے تو دکھاتی تھی چمک اپنی رگنی
اب پیشِ نگاہ ہیں دینیس وینی
کہتے ہیں حریف ہنس کے ازرہِ طعن
جب دین کھویا تو دنیا بھی چھنی

ایضاً

پیدا جو ہوئے غُل مچانے والے
دل اُن کا نہیں ہم بڑھانے والے
لیکن بادب کریں گے یہ عرض کہ "ہیں
اس فن کے حضور ہی سکھانے والے"

ایضاً

تھا امن کسی قدر سو وہ دن بھی چلے
ظاہر ہی کے سمت اہلِ باطن بھی چلے
مجلس پہ ہوا اضافۂ کانفرنس
مسلم تو جا چکے تھے مومن بھی چلے

اکبر

تھا سر میں کمال وہ تو سلطان بنا — تھا دل میں جمال وہ مسلمان بنا
لذت طلبی سے نفس رندی پہ جھکا — تھا پیٹ بہت حریص شیطان بنا

ایضاً

تدبیر کریں تو اُس میں ناکامی ہو — تقدیر کا نام لیں تو بدنامی ہو
القصہ عجب ضیق میں ہیں ہندی — یورپ کا خدا کہاں ہے جو حامی ہو

ایضاً

تعلیم بھی پائی، سب کے پیارے بھی ہوئے — دنیا کو بھی خوش کیا، ہمارے بھی ہوئے
لیکن جو یہ نورِ طبع پایا نہ گیا — پھر کیا، جو تم عرش کے تارے بھی ہوئے

ایضاً

تم ملو یا نہ ملو مجھ سے، منو یا نہ منو — ساتھ رہنا ہے اسی ملک میں اے ہموطنو
اہلِ مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو قیام — آسماں تنگ ہو تم پر، مگر اتنا نہ تنو

ایضاً

تہمد پہ ہے شبہ وہ حقارت کی نظر — پتلون پہ غصہ و شرارت کی نظر
بہتر ہے یہی برہنہ پھریے اکبر — شاید پڑ جائے ان کی رغبت کی نظر

ایضاً

جاتی رہی وعظ مذہبی کی قوت — ہر سر میں سمائی خودسری کی قوت
اطفال کو ناز ہے، مگر قومی آنکھ — روتی ہے کہ ہے یہ خودکشی کی قوت

حالی

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اِخواں پکّا ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکّا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکّا

اکبر

جب کہا میں نے ”خدا سے آپ ڈرتے کیوں نہیں؟“ وہ بگڑ کر بول اٹھے ”آپ مرتے کیوں نہیں؟“
جب یہ حالت ہے طبائع کی تو کیوں کہتے ہیں گو اکبر اٹھتے کیوں نہیں، واعظ بجھتے کیوں نہیں

ایضاً

جب نورِ یقیں نہیں بصیرت کیسی طاقت ہی نہیں دلوں میں ہمّت کیسی
اسلام نئی روشنی میں کیا ہو یک رخ مسجد ہی نہیں تو پھر جماعت کیسی

ایضاً

جس بات میں تم شکستِ ملّت سمجھو اس میں شرکت کو اپنی ذلّت سمجھو
جو بندۂ نفس ہو مخالف اس کا قومی غیرت کی اُس میں قلّت سمجھو

ایضاً

جس سے جو بن پڑے وہی کام کرے صاحب بنے، کمائے کھیلے، آرام کرے
لیکن رہے قومی بھائیوں کا ہمدرد ہر حال میں اِدّعائے اسلام کرے

ذوق

جن کو اس وقت اسلام کا دعوا ہے کمال غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے اُن کا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقّال

اکبر

جو حسرتِ دل ہے وہ نکلنے کی نہیں — جو بات ہے کام کی وہ چلنے کی نہیں
یہ بھی ہے بہت کہ دل سنبھالے رہیے — قومی حالت یہاں سنبھلنے کی نہیں

حالی

جو کرتے ہیں کچھ، زباں سے کہتے ہیں وہ کم — ہوتے نہیں ساتھ جمع دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسنِ گفتار — بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

اکبر

چیخے، چلائے، کودے، اُچھلے، ٹہلے — ہر پھر کے وہیں رہے جہاں تھے پہلے
حالت تو وہی ہے، بلکہ اس سے بدتر — یوں مونہہ سے جو جسکے دل میں آئے کہہ لے

ایضاً

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو — باتیں جو بری ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر — اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

حالی

حالی رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا — خطرہ انھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن ان بھیڑیوں سے واجب ہے حذر — بھیڑوں کے لباس میں جو ہیں جلوہ نما

اکبر

حضرت خود واقعات تصنیف کریں — ہم بیٹھ کے انجمن میں تعریف کریں
فطرت پہ نگاہ جن بزرگوں کی ہو — بہتر ہے یہی وہ نہ تکلیف کریں

اکبر

خلقت جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے — بے غیرت و بے دلیل ہو جاتی ہے
گو جسم میں ظاہر توانائی ہو — اخلاق میں وہ علیل ہو جاتی ہے

ایضاً

خواہش ہے اگر تجھکو غنی بننے کی — دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی — کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

ایضاً

خواہ صاحب کو تم سلام کرو — خواہ مندر میں رام رام کرو
بھائی جی کا فقط یہ مطلب ہے — جس میں روپیہ ملے وہ کام کرو

ایضاً

دل سے دھرم اٹھا تو اب ذات بھی توڑ — ویران ہوئی کھیتی تو عمارات بھی توڑ
برباد کر خوب "منو جی" کے چمن — باقی نہ رہے پھول تو اب پات بھی توڑ

حالی

دنیا کو دیے دین نے اسرار و حکم — دنیا نے کمر دین کی تھامی جس دم
گو دین کی ممنون بہت ہے دنیا — دنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

اکبر

دنیا ہی نے دین کو بھلا رکھا ہے — غفلت ہی کی نیند میں سلا رکھا ہے
اس دور میں خوش نصیب وہ ہے اکبر — جس جس نے کہ قرآن کھلا رکھا ہے

اکبر

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے لذّت وہ ہے کہ جوشِ صحت سے ملے
ایمان کا ہو نور دل میں وہ راحت ہے عزّت وہ ہے جو اپنی ملّت سے ملے

حالی

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبّا باقی
دھو شوق سے دھبّہ کو پہ اتنا نہ رگڑ دھبّہ رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اسمٰعیل

دین اور دنیا کا تفرقہ ہے مہمل نیّت ہی پہ موقوف ہے تنقیح عمل
دنیا داری بھی عین دینداری ہے مرکوز ہو گر رضائے عزّ و جلّ

اکبر

رغبت جو دلائی وسعتِ مشرب کی شامل اس میں غرض تھی سب کی
لیکن تبدیلِ وضع و نقلِ فاتح ہے بعض کی بات اور اپنے ہی مطلب کی

ایضاً

رسوا وہ ہوا جو دست پیما نہ ہوا لپکا ہے جو سائے پر وہ دلوا نہ ہوا
انگلینڈ سے اپنا دل جو لایا نہ درست محروم ادھر، اُدھر سے بیگانہ ہوا

حالی

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا جو کر کے بھلا خلق سے سنتے ہیں بُرا
ان گالیوں کا ہے جن کو چسکا حالی آتا نہیں اُن کو کچھ دعاؤں میں مزا

حالی

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں — بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں — خوبی کوئی باقی نہیں جب امت میں

ایضاً

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں — پر آیا جب امتحان کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہئے اب کیا ہے صلاح — فرمایا کہ بھائی جان ابھی ہے تو جہاں

اکبر

سر رشتۂ اتحاد ہم سے چھوٹا — آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے لوٹا
قرآں کے اثر سے روک دینے کے لئے — ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

ایضاً

سمجھے جو کوئی برا یہ مضمون نہیں — کوئی پہلو خلاف قانون نہیں
ہرچند یہ مزے چکھاتا ہے بہت — شیطان کا کوئی شخص ممنون نہیں

جرأت

سمجھے نہ امیر ان کو کوئی، اور نہ وزیر — انگریزوں کے ہاتھ ایک قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں — بنگالے کی مینائیں یہ پورب کے امیر

اکبر

سنتا نہیں کچھ کسی سے بڑھ بڑھ کے سوا — کہتا نہیں کوئی کچھ، پڑھ پڑھ کے سوا
پڑھنے کا نہ ٹھیک اصول، پڑھنے کی نہ رو — قبلہ نہیں کوئی اب علی گڑھ کے سوا

اکبر

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور
کہتا نہیں میں تم سے کہ ہو اُس سے نفور
سوتوں کو جگایا ہے اُنھوں نے لیکن
اللہ کا نام لے کے اُٹھنا ہے ضرور

ایضاً

سید کی طرف تو چندہ لانے کی ہے بیخ
اور شیخ کے گھر میں نیچگانے کی ہے بیخ
بہتر ہے یہی کہ بُت پرستی کیجیے
گو اس میں بھی صبح کو نہانے کی ہے بیخ

ایضاً

شہوات کی پیروی کا منصوبہ نہ ہو
دولت ترس خادمہ ہو محبوبہ نہ ہو
شہرت جو کمال سے ہو پیدا ہو جائے
لیکن بہ تکلفات مطلوبہ نہ ہو

ایضاً

شیطاں واعظ ہے پنبہ در گوش رہو
غالب ہے اسی کی بات خاموش رہو
بدلا پاتا ہوں مجلسِ دہر کا رنگ
مستی کی ہوس نہ ہو تو بے ہوش رہو

حالی

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میداں
برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشاں
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقاں
یاد آئی ہیں قوم کے ادبار کی شان

اکبر

طاقت وہ با اثر جو سلطانی ہے
اس جلوہ ہے چمک جہاں زر افشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر
اچھی وہ تربیت جو روحانی ہے

اکبر

عجم کی زینتیں سیکھیں مباہاتِ عرب سیکھیں　　زمانے کی ترقی جو سکھائے انکو سب سیکھیں
مگر اک التماس ان نوجوانوں سے میں کرتا ہوں　　خدا کے واسطے اپنے بزرگوں کا ادب سیکھیں

ایضاً

عزت کا ہے نہ اوج، نہ نیکی کی موج ہے　　حملہ ہے اپنی قوم پہ لفظوں کی فوج ہے
اس طرزِ تربیت پہ ہیں اغیار خندہ زن　　لاحول باپ کی ہے، تو ماؤں کی نوج ہے

حالی

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے　　ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں　　کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

اکبر

غالب انسان پہ خود پسندی ہے فقط　　مذہب کیا ہے گروہ بندی ہے فقط
ہر ذرہ و مہر سے یہ آتی ہے صدا　　نعمت ہے اگر تو عقلمندی ہے فقط

ایضاً

فرمائیں میرا قصور حضرت جو معاف　　جو امر ہے واقعی گزارش کروں صاف
انکار نہیں نماز روزے سے مجھے　　لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف

ایضاً

قائم بھی بوٹ اور موزہ رکھئے　　دل کو مشتاقِ مِس ڈسوزہ رکھئے
ان باتوں پہ معترض نہ ہوگا کوئی　　گر پڑھئے نماز اور روزہ رکھئے

اکبر

قسمت کو کہاں، کہ اب وہ تقسیم نہیں ۔ کیوں کر وہ اثر ہو جب وہ تعلیم نہیں
لغزش پہ مری بُرا نہ مانو اے شیخ ۔ وھسکی کی ہے لہر، موجِ تسنیم نہیں

اسمٰعیل

قلاش ہے قوم، تو پڑھے گی کیوں کر ۔ پس ماندہ ہے اب تو پھر بڑھے گی کیونکر
بچوں کے لئے نہیں ہے اسکول کی فیس ۔ یہ بیل کہو منڈھے چڑھے گی کیونکر

اکبر

قولِ ملحد ہے کہ نیچر ہو گیا میرا معین ۔ اور فلک کی ہے صدا "واللہ خیر الماکرین"
اب خوشی سے ہم تماشا دیکھتے ہیں دہر کا ۔ دیکھنا ہے کون سچ کہتا ہے دنیا یا کہ دین

ایضاً

قوم پر ممبری کا فیر ہوا ۔ کل جو اپنا تھا آج غیر ہوا
شیخ جی مر گئے کمیٹی میں ۔ غل مچا خاتمہ بخیر ہوا

ایضاً

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا ۔ قومی خصلت کا سر سے اٹھا سایا
کہتے تھے ولد کو پہلے سِرُّ لابیہ ۔ سُنز لکھا سنز کا اب وقت آیا

ایضاً

کالج نہیں ہے دینی فوائد کے لئے ۔ قائم ہے یہ ایسے ہی مقاصد کے لئے
مسجد میں یہاں جو مولوی صاحب ہیں ۔ کپتان ہیں مذہبی قواعد کے لئے

شبلی

کامیابی میں بس اک آدھ برس باقی ہے لیگ سے سلسلۂ کانگرس باقی ہے
اب بھی آجاتی ہے کالج سے خوشامد کی صدا جا چکا قافلہ اب بانگِ جرس باقی ہے

حالی

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

انیس

کس بات میں کید کس میں تنزویر نہیں جز حرفِ غلط زباں پہ تقریر نہیں
اس عہد میں راستی کا کیوں کر ہو رواج ہر سطر کج ہے قلم کی تقصیر نہیں

حالی

کہتا تھا کل اک منکرِ قرآن و خبر کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑ کر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

ایضاً

کہنا فقہا کا مومنو کو بے دیں سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہو گا مرقد میں سوال تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں؟

ایضاً

کیا اس کی خوشی کہ تم کو ہے عقل کثیر ہم کو تو اسی سے کر دیا تم نے فقیر
ہرگز یہ نہیں ہے حسنِ قانونِ خدا کہتے ہیں حضور اس کو حسنِ تدبیر

اسمٰعیل

کیا کہتے ہیں اس میں مفتیانِ اسلام جب بیعِ مساجد سے نہیں چلتا کام
تو وجہِ کفنان کے لئے مومن کو جائز بھی ہے یا نہیں خدا کا نیلام؟

اکبر

گذرا ہے مری نظر سے سب کا جلوا ہر شام و سحر کا روز و شب کا جلوا
کہتا عجم، عجم میں ہے جم موجود کہہ دو کہ عرب میں دیکھ رب کا جلوا

ایضاً

گردن خالق کے آگے جھکتی ہی نہیں اب ابتری سے یہ قوم رکتی ہی نہیں
ہوتی نہیں ان میں کچھ بھی غیرت پیدا اور بات اکبر کی ہے کہ چلتی ہی نہیں

ایضاً

گو رہتے ہیں ممبری فانی پر۔ شاد لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر۔ شاد
کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی عاقل ہیں کرمی رہوانی پر شاد،

اسمٰعیل

لاکھوں چیزیں بنا کے بھیجیں انگریز سب کرتے ہیں و نادانِ ہوس اُن پر تیز
چڑھتے ہیں مگر علومِ انگریزی سے گڑ کھاتے ہیں اور گلگلوں سے پرہیز

اکبر

لذت چاہو۔ تو وصلِ معشوق کہاں شوکت چاہو تو زر کا صندوق کہاں
کہتا ہے یہ دل کہ خودکشی کی ٹھہری خیر اس کو بھی مان لیں تو بندوق کہاں

اکبر

لے جاؤں لحد میں اپنا اسلام بخیر لکھیں یارب، ملک میرا نام بخیر
اسلام سے جس نے بیوفائی کی ہے پایا نہیں میں نے اُس کا انجام بخیر

ایضاً

مادہ نہیں اتنی مضطرب نر کے لئے آمادہ ہیں جس قدر وہ آنر کے لئے
نو حصے تم اپنی نوکری کو دے دو دسواں حصہ تو ہو پیمبر کے لئے

ایضاً

ماشاء اللہ وہ ڈنر کھاتے ہیں بنگالی بھائی اُن کا سر کھاتے ہیں
بس ہم ہیں خدا کے نیک بندے اکبر اُن کی گاتے ہیں اپنے گھر کھاتے ہیں

ایضاً

مذہب اور مولوی پہ گالی ہوئی اسپیچ پہ انجمن میں تالی ہوئی
دروازہ منصفی ہے ہم پر کیوں بند ہر بات تو اے جنابِ عالی ہوئی

ایضاً

مذہب جس کی نظر میں بالکل گم ہے کیوں کر میں کہوں، وہ داخلِ مردم ہے
شائستہ جو ہو تو اس کو پونی سمجھو ایسا جو نہ ہو تو اک خرِ بے دُم ہے

ایضاً

مذہب قانون و قوم کا بانی ہے خالص طاعت عروج روحانی ہے
توہین اک دوسرے کی کرتے ہیں جو لوگ وہ جہل ہے یا ہوائے نفسانی ہے

اکبر

مذہب کا معاشرت سے ہے ربط کمال   دونو جو ہوں مختلف تو آرام محال
پہلے تو یہ مسئلہ سمجھ لیں احباب   بعد اس کے رفارم کا کریں دل میں خیال

ایضاً

مذہب کے جو ہو رہیں تو سرکار کا خوف   مذہب سے اگر پھریں تو پھٹکار کا خوف
دونوں سے اگر بچیں تو احباب کو ہے   بیرونقیِ دوکان و دربار کا خوف

ایضاً

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا   چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر   قسمت ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

ایضاً

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اڑ جائے   مطلب کی کہوں تو پالسی میں اڑ جائے
باقی سرِ قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش   غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اڑ جائے

ایضاً

مشرق کے جو ہو رہے وہ پستی میں پڑے   مغرب سے سبق لیا تو مستی میں پڑے
پیدا ہی نہ ہوتے کاش اطفال یہاں   آخر یہ کیوں بلائے ہستی میں پڑے

ایضاً

نکتہ یہ سنا ہے ایک بنگالی سے   کرنا ہو بسر جو تم کو خوشحالی سے
خالی ہو جگہ تو اپنے بھائی کو دو   غصہ آئے تو کام لو گالی سے

اکبر

نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زباں   مطلب یہ ہے کہ سمجھے اُن کے فرماں
مقصود میاں کی سی نہیں عقل و تمیز   اس نکتے کو کیا وہ سمجھیں جو ہیں ناداں

ایضاً

وہ لطف اب ہندو و مسلماں میں کہاں   اغیار گذرتے ہیں اُنپہ خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا زباں کی کبھی بحث   ہے سخت مُضر یہ نسخۂ "گاؤ زباں"

ایضاً

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی   ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت اب سیکھ   عزت کے لئے ہے کافی اے دل نیکی

حالی

ہرچند بُرا ہے عشق کا سب کے مآل   پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بدفال
سلطاں ہے اگر ظلِ الٰہی، تو عشق   ہے ظلِ الٰہی کے لئے وقتِ زوال

اکبر

ہرچند کہ کوٹ بھی ہے، پتلون بھی ہے   بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے، صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھسے پوچھتا ہوں ہندی!   یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

ایضاً

ہمدرد ہوں سب یہ لطف آبادی ہے   ہمسایہ بھی ہو شریک تب شادی ہے
تسکین ہے جبکہ ہو خدا پر تکیہ   قانون بنا سکیں تب آزادی ہے

اکبر

اب ہم ہیں وہ خوبی و نکوئی نہ رہی
پاکیزگی و خجستہ خوئی نہ رہی
تعلیم جدید سے ہوا کیا حاصل
ہاں کفر کے ساتھ جنگجوئی نہ رہی

ایضاً

ہم نے واعظ کی خوب ڈاڑھی نوچی
یہ بات مگر نہ اپنے دل میں سوچی
مذہب کو شکست دے کے کیا پائیں گے
آخر کو رہیں گے موچی ہی کے موچی

ایضاً

ہم نیک خصال ہیں یہ تسلیم نہیں
دنیا میں اس روش کی تکریم نہیں
لیکن یہ ہیں طریق و عادات عجم
واللہ کہ یہ عرب کی تعلیم نہیں

ایضاً

ہمہ تن درد کا مضمون ہوا جاتا ہے
حالت ایسی ہے کہ دل خون ہوا جاتا ہے
اتفاقاً امر مصیبت کو میں سمجھا تھا مگر
اب وہ میرے لئے قانون ہوا جاتا ہے

حالی

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
دو آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

اکبر

ہوئی ہے نصیب تلخ کامی تم کو
محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو
اغیار نہیں بنا سکے تم کو غلام
ہے اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

حالی

ہے تجھسے نہاں جیسی مغرب کی زمیں مشرق کو وہ فیض تجھسے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہِ نخشب کی طرح رہتی ہیں شعاعیں تری محدود وہیں

ایضاً

ہیں لے ہنروں میں قابلیت کے نشاں پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ ہیں طوسی و رازی انہی شکلوں میں نہاں

اکبر

ہیں لمپ عزیز شمع بیگانہ ہے جلتا ہے چراغ سا جو فرزانہ ہے
سب کی ہے رسوں کے روئے روشن پہ نگاہ جو ہے نئی روشنی کا پروانہ ہے

ایضاً

یا کس کے کمر پئے خوشامد باندھو یا حجرے میں گھس کے بیٹھو اتھد باندھو
کیا فائدہ بے فرنگی سے اے شیخ بہتر ہے یہی کہ اپنی اک حد باندھو

ایضاً

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں جسکے سر چاہیں لاکھ تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

ایضاً

یہ بات غلط کہ ملکِ اسلام ہے ہند یہ جھوٹ کہ ملکِ لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہِ انگلش یورپ کے لئے بس ایک گودام ہے ہند

اقوالِ زرّیں

اکبر

آزادے دیں کا گرفتار اچھا — شرمندہ ہو دل میں وہ گنہگار اچھا

ہر چند کہ زُور بھی ہے اک خصلتِ بد — واللہ کہ بے حیا سے ستمگار اچھا

میر

اب وقتِ عزیز کو تو یوں کھوؤ گے — پھر سوچ کے غفلت کے تئیں روؤ گے

کیا خوابِ گراں پہ میلِ روز و شب ہے — جاگو ٹک میرا پھر بہت سوؤ گے

حالی

احسان کے ہے گر صلہ کی خواہش تم کو — تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو

کرتے ہو اگر احسان تو کر دا سے عام — اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

دبیر

ادنا سے جو سر جھکائے اعلیٰ وہ ہے — جو خُلق سے بہرہ ور ہے دریا وہ ہے

کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی دبیر — سمجھے جو بُرا آپ کو اچھا وہ ہے

اسمٰعیل

اسراف سے احتراز اگر فرماتے — کیوں گردشِ ایّام کی سیلی کھاتے

انگشت نما تھی کج کُلاہی جن کی — وہ پھرتے ہیں آج جُوتیاں چٹخاتے

بیان و پندانی

اعجازِ بشر ہے عجز کوشی کے لئے　　یہ جلس نہیں ہے خود فروشی کے لئے
بے وجہ نہیں، یہ سات پردے غافل　　ہے خانۂ چشم عیب پوشی کے لئے

سودا

افسوس کریموں میں نہیں یہ دستور　　مفلس پہ کرم کرکے نہ ہوویں مغرور
جھکتا ہے اگر شاخِ ثمردار کا ہاتھ　　پھل دیکے وہیں آپ کو کھینچے ہے دور

حالی

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا　　ہوگا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھ سا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر　　اُس سے بھی گیا جس کے لاکھوں ہوں خدا

دبیر

اندھیر، جو خیر میں ریا کرتے ہیں　　برباد نکوئی کی جزا کرتے ہیں
غیروں کو مثالِ روشنی فائدہ ہے　　مانندِ چراغ خود جلا کرتے ہیں

اسمٰعیل

انسان کو چاہئے نہ ہمت ہارے　　میدانِ طلب میں ہاتھ بڑھ کر مارے
جو علم و ہنر میں لے گئے ہیں بازی　　ہر کام میں ہیں اُنھیں کے وارے نیارے

حالی

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا　　کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا اُن کی گردن پہ وبال　　دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

حالی

اک منعمِ مسرف نے یہ عابد سے کہا کہ میرے لئے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سوئے چرخ محتاج کر اس کو جلد اے بارِ خدا

ایضاً

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذّت سے ندامتوں کی جانا ہم نے وہ نُرخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

دبیر

اے تن تو فروتنی و مسکینی کر اے دل چمنِ علم کی گلچینی کر
گر مدِّ نظر ہے چشمِ مردم میں جگہ پتلی کی طرح ترکِ خود بینی کر

ذوق

اے ذوق کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا ایک دم نہ تیرا صرفِ مناجات ہوا
جب تک تھا جوان، تھا جوانِ بدمست اب پیر ہوا پیرِ خرابات ہوا

حالی

اے عشق کیا تو نے گھرانوں کو تباہ پیروں کو خراب اور جوانوں کو تباہ
دیکھا سدا سلامتی میں تیری قوموں کو ذلیل خاندانوں کو تباہ

ایضاً

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے سرچشمۂ نعماءِ ایادی تو ہے
آسائشِ دو جہاں ہے سائے میں ترے دنیا کا وسیلہ دین کا ہادی تو ہے

ظہیر

بد اصل سے ہے خطا کی اُمّید   نیکی کی اُمید ہے بدی کی اُمّید
کرتا ہے حلال یہ اُسی کو پہلے   رکھتا ہو جو اس سے دوستی کی اُمّید

حالی

بیٹا نہ نکلے جب تلک ذلت سے   عزّت نہیں اس کو باپ کی عزّت سے
سوچو تو ہے کھا و کا نسب بھی عالی   پر اس کو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

دبیر

بلبل یہ زمانہ ایک گل کا نہ ہوا   محکوم ائمہ و رسُل کا نہ ہوا
بندے کو عبث دعویٰ یکتائی ہے   اللہ پر اتفاق کل کا نہ ہوا

اکبر

پاکیزہ گئے نفس کی دشمن مے ہے   انسان کو خراب کرنیوالی شے ہے
شیطان کی ہے پرائیویٹ سکرٹری   مسلم اور اس کو منہ لگائے ہے ہے!

اسمٰعیل

تاریک ہے رات اور دریا زخّار   طوفان بپا ہے اور کشتی بیکار
گھبرائیو مت کہ ہے مددگار خدا   ہمت ہے تو جا لگاؤ کھیوا اُس پار

اکبر

تحصیل علوم کر کہ دولت ہے یہی   اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھو اے عشرت   محفوظ ہو معصیت سے عزّت ہے یہی

حالی

تعریف سے کھل جاتے ہیں ناداں فی الفور ۔ داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
ہوتے ہیں بہت وہ مدح سُنکر ناخوش ۔ مقصود یہ ہے کہ ہو نہ ستائش کچھ اور

اسمٰعیل

تیزی نہیں منجملۂ اوصافِ کمال ۔ کچھ عیب نہیں اگر چلو دھیمی چال
خرگوش سے لے گیا ہے کچھوا بازی ۔ ہاں راہِ طلب میں شرط ہے استقلال

حالی

تیمور نے اک مور چیونٹی زیرِ دیوار ۔ دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سو بار
آخر سرِ بام لے کے پہونچا تو کہا ۔ مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار

ذوق

جب تک تھے گرہ میں احمقوں کے پیسے ۔ سب کہتے تھے اُنکو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق ۔ پوچھا نہ کہ تھے وہ کون ایسے تیسے

اسمٰعیل

جب تک کہ سبق ملاپ کا یاد رہا ۔ بستی میں ہر ایک شخص دل شاد رہا
جب رشک و حسد نے پھوٹ انمیں ڈالی ۔ دونوں میں سے ایک بھی نہ آباد رہا

حالی

جبریہ اور قدریہ کی بحث و تکرار ۔ دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
ہمت میں جو کم تھے ہو گئے وہ مجبور ۔ جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

اسمٰعیل

جس درجہ ہو مشکلات کی طغیانی ہو اہلِ ہمم کو اور بھی آسانی
تیراک اپنا ہنر دکھاتا ہے خوب ہوتا ہے جب اس کے سر سے اونچا پانی

دبیر

جو اہلِ ہنر کا عیب جو ہوتا ہے بد اس کا ہر اک فعلِ نکو ہوتا ہے
جب نقصِ زر و سیم وہ کرتا ہے عیاں خود سنگِ محک سیاہ رو ہوتا ہے

حالی

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

میر

چپکے رہنا نہ میر دل میں ٹھانو بولو چالو، کہا ہمارا مانو
اک حرف نہ کہہ سکو گے وقتِ رفتن چلنے کو زباں کے غنیمت جانو

اسمٰعیل

چھاپے کی طرح تو کتابوں سے نہ لد حاصل ہے کتاب کا فقط علم و خرد
کیڑوں نے ہزار ہا کتابیں کھالیں پائی نہ مگر کبھی فضیلت کی سند

حالی

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی اندیشۂ فوت ہو، نہ ہو خوفِ زوال

اکبر

حاسد جو کوئی تجھ پہ حسد کرتا ہے — کر صبر کہ خود وہ کارِ بد کرتا ہے
اپنی پستی کو کر رہا ہے محسوس — اور تیری بلندیوں سے کد کرتا ہے

حالی

حق بول کے اہلِ شر سے اڑنا نہ کہیں — بھڑکے گی مدافعت سے اور آتش کیں
گر چاہتے ہو کہ چپ رہیں اہلِ خلاف — جز ترکِ جواب، کوئی تدبیر نہیں

اکبر

خاطر مضبوط دل توانا رکھو — امید اچھی، خیال اچھا رکھو
ہو جائیں گی مشکلیں تمہاری آساں — اکبر اللہ پہ بھروسا رکھو

حالی

خوش رہتے ہیں دکھ میں کامرانوں کی طرح — ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل ان کے ہیں، ظرف انکے، جو کرتے ہیں بسر — ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

ذوق

دل کو سرِ بازارِ جہاں کر نہ اچاٹ — جس طرح بنے سود و زیاں میں دن کاٹ
اے ذوق فلک کے جب ہیں بارہ حصے — سودا ہو نہ کیوں زیرِ فلک بارہ باٹ

حالی

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو — رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

حالی

دولت نے کہا مجھ سے ہے اعزازِ جہاں فرمایا ہنر نے میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی غلط ہے دونوں کا بیاں میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

ایضاً

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا زردار ذرا سوچ سمجھ کے ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک ہے جوہرِ انساں کی کسوٹی سونا

اکبر

رشوت ہے گلوئے نیک نامی کا چھرا عیاشی ہے بدی کے پہیے کا دھرا
ہر چند بے محل خوشامد ہے بری گستاخ مگر خوشامدی سے بھی برا

جرأت

ظالم سے نہ ظلم جائے، گو ہو وہ پیر چوکے نہ شرارتوں سے جو ہووے شریر
دیکھو نا، کہ بزم میں بغیر از زنداں سر کاٹے ہے شمع کا وہاں گلگیر

حالی

غصہ پہ کسی کے غصہ آتا ہے وہیں جب تک کہ رہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر پھر کس سے ہوں آزردہ، کہ تو تو ہی نہیں

ایضاً

فتنہ کو جہاں تلک ہو دیجے تسکیں زہر اگلے کوئی تو کیجیے باتیں شیریں
غصہ غصے کو اور بھڑکاتا ہے اس دکھ کا علاج بالمثل نہیں

اسمٰعیل

فطرت کے مطابق اگر انساں لے کام حیوان تو حیوان جمادات ہوں رام
مٹی، پانی، ہوا، حرارت، بجلی دانشمندوں کے ہیں مطیعِ احکام

حالی

قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار حاشا کہ ہوں ان پہ نظمِ عالم کا مدار
جو نیک ہیں اُن کو نہیں حاجت انکی اور بد نہیں بنتے نیک ان سے زنہار

اکبر

کچھ منع نہیں ہر اک کی تحریر پڑھو لیکن قرآن کی بھی تفسیر پڑھو
عظمت دنیا کی جب دبائے دل کو خالق کا کرو خیال تکبیر پڑھو

حالی

کرتے ہیں سفیہ گر مذمت تیری کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پھر مدح کریں وہ گر نصیبِ اعدا رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

دبیر

کم مایہ سبک پیشِ جہاں ہوتا ہے میزاں سے بدیہی یہ عیاں ہوتا ہے
خوردوں سے تواضع ہے بزرگی کی دلیل جھکتا ہے وہ پلہ جو گراں ہوتا ہے

حالی

کوشش میں ہے شرطِ ابتدا انساں سے پھر چاہیئے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا پائی نہ نجات نوحؑ نے طوفاں سے

تسلیم

کیا غم، سفر ملکِ عدم کا کرتے — کیوں مثلِ حباب دم فنا کا بھرتے
معلوم تھا گر عمر گریزاں ہے یہی — اک روز پہونچ جائیں گے جیتے مرتے

حالی

کیا فرق؟ سماعت نہ ہو جب کانوں میں — دانائی کی باتوں میں اور انسانوں میں
غربت میں ہے اجنبی مسافر جس طرح — دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

انیس

کیا قدر ہے زمیں کی آسماں کے آگے — جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگدل ہوتے ہیں — صف بستہ ہیں دندان زباں کے آگے

مجروح

کیا وضع تواضع نے سنواری میری — ہے قابلِ دید نغز کاری میری
کی جھک کے ہر اک سے سربلندی حاصل — ہے گنجِ مراد خاکساری میری

سودا

گر مہ سے بلندی میں ہوا تو وہ چند — پستوں کی طرف دیکھ کے مت ہو خرسند
جانے کہ بلندوں کی ہیں نظروں میں پست — پستوں کی بھی نظروں میں ہیں اتنے ہی بلند

اسمٰعیل

گر نیک دلی سے کچھ بھلائی کی ہے — یا بدمنشی سے کچھ برائی کی ہے
اپنے ہی لئے ہے سب، نہ اوروں کیلئے — اپنے ہاتھوں سے جو کمائی کی ہے

ناسخ

لازم ہے کرو مسافروں کا اعزاز
اعزاز نہیں تو آؤ امراز سے باز
کرتا ہے خدا مسافروں پر کیا رحم
واجب ہے سفر میں دیکھلو قصر نماز

اکبر

تکبر سے ہے کچھ، نہ کچھ خیالات سے ہے
تہذیب سے ہے نہ ترک عادات سے ہے
اکبر بخدا یہ کامیابی ساری
تقدیر سے اور اتفاقات سے ہے

حالی

محنت ہی کے پھل ہیں یہاں اک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی
جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

ایضاً

مُسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
نعمت نہ خدا کی رائیگاں یوں کھوئیں
گر بخل پہ لوگ ان کے ہنسیں بہتر ہے
اس سے کہ فضولیوں پہ ان کی روئیں

ایضاً

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ
خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ منہ سے یا نہ بولیں حضرت
معلوم ہے ہم کو جتنے پانی میں ہیں آپ

دبیر

مغرور ذلیل و خوار ہر چشم میں ہے
اعزاز فروتنی کا ہر چشم میں ہے
سب پر روشن ہے خاکساری کا شرف
سرمہ جو ہوا سنگ تو گھر چشم میں ہے

حالی

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور ہر عیب سے بچیے تا بمقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ، پر خبردار رہو گھٹنے سے کہیں اُن کے نہ بڑھ جائے غرور

ایضاً

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مفت، یہ امکاں ہے مگر عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں

ایضاً

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انساں ممکن ہے بدی کا نہ رہے اس میں نشاں
ممکن تو ہے سب کچھ، پہ حقیقت یہ ہے انسان ہے اب تک ہی قرین الشیطاں

ایضاً

منزل ہے بعید۔ باندھ لو زادِ سفر مواج ہے بحر رکھو کشتی کی خبر
گاہک جو کس ہے۔ لے چلو مال کھرا ہلکا کرو بوجھ، ہے کٹھن راہگذر

ایضاً

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار بدظن نہ ہو عیب اس میں گر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر کر حسن و جمال کا نہ اس کے انکار

ایضاً

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

ایضاً

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بدائے فرزند — ایک آدھ ادا اُنکی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں — ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

ناسخ

ہر چند ہر اک امیر مومن ہے بڑا — پر حق تو یہ ہے امیر محسن، ہے بڑا
احسان کرو، اعتمادِ امارت پہ نہیں — ہے رات کبھی بڑی، کبھی دن ہے بڑا

اکبر

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر — دولت جو ملے اُسکو تو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھکو — جو اہل ہیں اسکے، ان کی تعظیم بھی کر

حالی

ہیں جھوٹ کے سچ میں سب سمونے والے — بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جنکی جیبوں میں مدام — اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

ایضاً

ہیں یار رفیق، پر مصیبت میں نہیں — ساتھی ہیں عزیز لیک ذلت میں نہیں
اُس بات کی انسان سے توقع ہے عبث — جو نوعِ بشر کی خود جبلت میں نہیں

ایضاً

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا — شیریں سخنی میں شہد فائق ہونا
ممکن نہیں جب تک کہ نہو دل میں نفاق — آسان نہیں مقبولِ خلائق ہونا

انیس

ہموار ہے گر تو کچھ تجھے باک نہیں سرکش ہے اگر تو عقل و ادراک نہیں
پاتا نہیں تند خو کدورت کے سوا دامن میں ہوا کے کچھ بجز خاک نہیں

اسمٰعیل

ہوتی نہیں فکر سے کوئی افزائش چپکے رہنے میں ہے بڑی آسائش
کہنا سننا تو ہے نہایت آساں کہنے سننے کی ہو اگر گنجائش

حالی

ہو بادہ کشی پہ نہ جوانو مفتوں گردن پہ نہ لو عقلِ خداداد کا خوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے اب تم کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اور جنوں

ایضاً

ہے جان کے ساتھ کام انسان کیلئے بنتی نہیں زندگی میں بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح مردوں کی طرح جیئے تو کیا خاک جئے

غالب

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لئے وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد ملتے ہیں بدمعاش لڑنے کے لئے

حالی

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پر اتنی ہے خبر اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

اکبر

ہے حرص و ہوس کے فن کی مجکو تکمیل غیرت نہیں میری بزم دانش میں دخیل
ہیں نفس کی خواہشیں بہت مجکو عزیز جو چاہیں کریں خوشی سے مجکو وہ ذلیل

حالی

ہے نفس میں انساں کے جبلّی یہ مرض ہر سعی پہ ہوتا ہے طلب گار یہ عوض
جو خاص خدا کے لئے تھے کام کئے دیکھا تو نہاں ان میں بھی تھی کوئی غرض

ایضاً

سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے نہ ثواب زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب
بد تر ہے ہزار درجہ اے دوں ہمت سائل کے سوال سے ترا تلخ جواب

ایضاً

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ کافر کہا واعظ نے انھیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملی شہادت جس وقت لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

ایضاً

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
کرنے ہیں جو کام اُن کو جلدی نبٹاؤ طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

اکبر

یہ بو مرے گھر میں نہ اے شرابی پھیلا! ہے ترا دہن نجاستوں کا تھیلا
ہر لحظہ طلب ہے شراب کی تجھکو ہر دم ترے منہ سے ہے نکلتا دے لا!

چندہ

اکبر

چندوں ہی کے سوجتے ہیں ان کو مضموں ۔ دل شاد ہو اس سے قوم یا ہو محزوں
لڑکے انھیں دیکھ کر مچاتے ہیں دھوم ۔ یہ ہیں نئی روشنی کے چندا ماموں

ایضاً

کچھ بھی نہیں چاہتے وہ چندے کے سوا ۔ اس باغ میں کیا دھرا ہے پھندے کے سوا
گلچیں ہے ہر اک، نہیں ہے بلبل کوئی ۔ اس نکتہ کو کون سمجھے بندے کے سوا

ایضاً

کرتے ہی نہیں ہیں ان میں ذکر مولا ۔ ہے مانگ روپے کی دونلا، سہ نلا
مجلس ہے یہی، تو اس سے عزلت بہتر ۔ دنیا ہے یہی، تو ترک دنیا اولا

ترقی اردو

اکبر

اردو میں شریک جب تک ہونے کے نہیں ۔ اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں کہ شیخ امرالقیس بنیں ۔ پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

ایضاً

اقبال کے ساتھ اے خرد تو بھی گئی ۔ غیرت کے ساتھ مذہبی بو بھی گئی
سچ کہتے ہیں حضرت کرامت اکبر ۔ رخصت ہوئی فارسی تو اردو بھی گئی

سلسلہ نمبر ۴

خیابان ادب

دوستی

اکبر

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

حالی

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے جو طالب دوستانِ معصوم رہے
احباب سے بات بات پر جو بگڑے صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

مونس

توکل ہے اگر، تو سب کی غمخواری کر دشمن کی بھی مونس نہ دل آزاری کر
ہر دم رہے احباب کی الفت کا خیال دل ہیں یہ حباب، ان کی ہواداری کر

انیس

مال و زر و افسر و حشم ملتا ہے ممکن ہے نگیں طبل و علم ملتا ہے
عنقا، گوگردِ سرخ، پارس، اکسیر ملتے ہیں یہ سب، دوست کم ملتا ہے

حالی

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی اتنی ہی مُغائرت ہے یہاں اور خویشی
وہ دوست نہیں جس نے کیا فکرِ مآل ضدین ہیں، دوستی اور دور اندیشی

قدر ناشناسیٔ زمانہ

انیس

پرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے ہر گُل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

مومن

کی صرف کمال زندگانی ہم نے دیکھی نہ جہاں میں قدردانی ہم نے
افسوس کہ ایسے بے تمیزوں کا گلہ قدر اپنی کچھ آپ ہی نہ جانی ہم نے

سودا

مونھ پھیرے ہے گو دیکھ کے ہم کو عالم قدر اس سے تو کچھ اپنی نہیں ہوتی کم
اتنا ہی بڑا ہم کو کیا خالق نے خلقت کی نظر میں نہیں آسکتے ہم

انشا

میزان میں قیاس کی ہنر سے عاری جو شخص ہیں، طالع نے انھیں دی یاری
اعلیٰ درجہ کو پہونچے وہ، رہ گئے ہم کیوں ہو نہ گراں مایوں کا پلہ بھاری

میر

یاروں کو کدورتیں ہیں اب تو ہم سے جس روز کہ ہم جائیں گے اس عالم سے
اس روز کھلے گی ہماں، سب پہ یہ بات اس بزم کی رونق تھی ہمارے دم سے

سالگرہ

غالب

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا — اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں — ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

ایضاً

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے — تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ — ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

انیس

دل سے طاقت بدن سے کس جاتا ہے — آتا نہیں پھر کر جو نفس جاتا ہے
جب سالگرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا — یاں اور گرہ سے ایک برس جاتا ہے

سودا

سایہ ترا اے نخلِ امیدِ کہ و مہ — اس ملک کے دائم رہے ہر قریہ و دہ
بڑھتا ہے نے نیزہ گرہ سے جس طرح — دے طول تری عمر کو یوں سالگرہ

ایضاً

ہر چند کہ مخلوق ہیں حق کے کہ و مہ — پر تجکو کیا ہے حق نے ان سب سے بہ
از بسکہ عزیز نقدِ جاں ہے تیرا — دیتا ہے خدا اس لئے ہر سال گرہ

مدحت طرازی

دبیر

اس در پہ ہر اک شادماں رہتا ہے   خنداں گلِ امید یہاں رہتا ہے
ہر فصل میں دستِ افتخار الدولہ   نیساں کی طرح گہر فشاں رہتا ہے

سودا

اے خلق کے قبلۂ امید و آمال   شاد آج ترے دوست ہیں دشمن پامال
تا پہنیں خلعت بہار کے اشجار   ہو خلعتِ نو تجکو مبارک ہر سال

ایضاً

اے دابِ قوانینِ جہاں کے دستور   ہم چشم کی حرمت تجھے سب کی منظور
الطاف و کرم کا ہے جہاں میں جو کام   ایزد نے کیا اس پہ تجھی کو مامور

ذوق

خورشید سے یک روز جہاں میں نوروز   اور تجھسے جہاں روز مسرت اندوز
ہے تجکو زمانہ میں شرف دوازدہ ماہ   اور ہے مہرِ جہاں تاب کو یک ماہ یک روز

ایضاً

شاہا تجھے با دولت و بخت فیروز   فرخ ہو سدا جہاں میں جشنِ نوروز
ہووے شرف اندوز ترے طالع سے   ہر سال حمل میں مہرِ عالم افروز

ذوق

کہتا ہے یہ فیروزۂ رنگِ نوروز	تو ہو صفِ اعدا پہ مظفر فیروز
ہو دشمنِ سرکش کے لئے سہم الموت	اے شاہِ عدو کُش۔ تیرا تیرِ دلدوز

غالب

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم	آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم	ہے اب کے شبِ قدر و دیوالی باہم

سودا

یارب ہو مدام تجکو حق کی تائید	اور ہووے سدا دولت و اقبال مزید
ہر روز رہے تجبکو سرورِ نوروز	آیا کرے تا گھر میں شرف کے خورشید

قناعت

سودا

اے نفس دلی حرف کو میرے کرگوش	دنیا کی طلب میں جو ترا ہو ہمدوش
اس جیفہ پہ غرّاتا اسے دیکھ کے سگ	تیرا تو ہم جنس ہے وہ بھی، خاموش

میر

تیرا اے دل یہ غم فسردہ بھی ہوگا	اندیشۂ رزق کم کبھو بھی ہوگا
کھانے کو دیا ہے آج حق نے تجکو	کل بھی دیویگا، کل جو تو بھی ہوگا

دبیر

دل کو پئے جمع زر پریشاں نہ کیا سر کو سرگشتہ بہر ساماں نہ کیا
ہم تو ہیں ترے شکر گذار اے گردوں احساں کیا جو کہ ہم پہ احساں نہ کیا

انیس

دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں
لبریز ہیں یہ دولتِ استغنا سے آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

ایضاً

کیوں زر کی ہوس میں دربدر پھرتا ہے جانا ہے تجھے کہاں، کدھر پھرتا ہے
اللہ رے پیری میں ہوس دنیا کی تھک جاتے ہیں جب پانوں تو سر پھرتا ہے

ناسخ

ہر چند ہوں پیر اور سر پہ ہے اجل تس پر نہیں پیٹ کے سوا فکرِ عمل
ہے رشتۂ عمر مختصر سا لیکن شیطان کی آنت ہے مرا طولِ امل

انیس

ہر صبح کو دوڑ کر کدھر جاتا ہے کچھ گو ہر عزت کا خیال آتا ہے
گر ضامنِ روزی ہے خداوند کریم پھر کس لئے تو رزق کا غم کھاتا ہے

ایضاً

یہ حرص ہمکو لئے جا بجا پھرتی ہے پھرتے ہیں جدھر ساتھ قضا پھرتی ہے
فریاد کناں برائے یک دانۂ رزق یوں پھرتے ہیں جس طرح آسیا پھرتی ہے

مآل کار علم

ذوق

اس جہل کا ہے ذوقؔ ٹھکانا کچھ بھی
دانش نے کیا دل کو نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے
جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

حالی

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اس کے سوا اُن میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

حفظ نفس

انیس

عزت رہے یار و آشنا کے آگے
محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہِ مولا میں چلیں
جب ہاتھ یہ اُٹھیں تو خدا کے آگے

رند

گو مالک ملک و مسند و تاج نہیں
پر مجھ سا غنی جہان میں آج نہیں
صد شکر ہیں اے رندؔ اپنے خالق کے سوا
دنیا میں کسی غیر کا محتاج نہیں
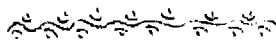
طلبِ باراں

انشا

جس وقت بڑے بھلوں کو رونا آوے خلقت کے جگر جلوں کو رونا آوے
برسے برسے ہے مینھ، نہ برسے کیوں کر کس طرح نہ بادلوں کو رونا آوے

ایضاً

روپا برسائیں گے رو پہلے بادل سونا برسائیں گے سنہلے بادل
امیّد نہ توڑ حق سے انشاء اللہ آپہونچے وہ دیکھ البلے گہلے بادل

ایضاً

ہے خشک پہاڑ کی چھاتی یارب یہ گرم ہوا نہیں خوش آتی یارب
کرابرِ کرم کو حکم برسے، ورنہ ہے گاوِ زمین کی جان جاتی یارب

ایضاً

یارب بطفیلِ اشکِ چشمِ زہراؓ فرماوے ابھی ایک ابر آوے گہرا
جل تھل بھر جادیں ہووے خلقت سرسبز لگ جاوے اسی گھڑی جھڑی کا لہرا

پاسِ وضع

مرزا دبیر سب درباریوں کی طرح بادشاہ کو خداوندِ نعمت نہ کہتے، بلکہ دوسرے آداب والقاب شاہی استعمال کرتے تھے۔ خوردہ چینوں نے دراندازی کی۔

اس پر اُنھوں نے یہ رباعی کہی۔

دانا کہوں دل کو کہ خردمند کہوں　　یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو مونھ دکھانا ہے وحیؔد　　کس مونھ سے میں بندوں کو خداوند کہوں

تنگیٔ جگہ کی شکایت

شیخ ناسخ بالکل سیاہ فام اور بڑے لحیم شحیم تھے۔ بے ادب گستاخ دُم کٹے بھینسے کی پھبتی کہا کرتے تھے۔

شک مجکو جنازے کا ہے جو ہلی پر　　سمجھا ہیں لحد سرائیں جب پایا یہ گھر
بے حس ہے بدن ضعف سے آنکھیں ہیں بند　　مردوں کی طرح کیا ہے میں نے یہ سفر

ممکن نہیں ایسی ہو کوئی تنگ پینس　　اعضا ہیں شکنجے میں تو محبوس نفس
ہوں زمزمہ سنج بوستاں، یعنی　　ہو جاؤں نہ کس طرح گرفتارِ قفس

گزند پا

۱۹۰۷ء میں اتفاقیہ بندوق چل جانے سے علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی پنڈلی کی ہڈی چُور چُور ہو گئی۔ جسکے باعث گھٹنے پر سے ٹانگ کاٹ دینی پڑی تھی۔

مقبول نہیں ہے بینوائی میری　　آلودۂ نخوت ہے گدائی میری
تقدیر نے پانوں کاٹنے پر بس کی　　ناقص ہے ابھی بے سروپائی میری

ہر چند کہ زخم جاں فرسا تھے آثار ہلاک سر بسر پیدا تھے
ممنون ہوں ضبط کا کہ اس حال میں بھی گو پاؤں کٹے مگر قدم بر جا تھے

ارمغانِ عقیدت

سکھوں کے عہدِ حکومت میں سید احمد صاحب بریلویؒ نے پنجابی مسلمانوں کی حمایت میں جہاد کیا تھا۔ مومن خاں سید صاحب کے مرید تھے۔

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایماں ہے معرکۂ جہاد چل دیجے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

ہر چند منافق سراپا بدعت ہے کفر و ضلال و فسق جنکی طینت
بتلاتے ہیں بدعتی امام حق کو گویا کہ جہاد ہے خلافِ سنت

بے نیازی

مرزا سودا کا شہرہ جب نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سنا تو کمال اشتیاق سے طلب کیا۔ انھیں دلّی چھوڑنی گوارا نہ ہوئی۔ جواب میں فقط اس رباعی پر حسنِ معذرت کو ختم کیا۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

افترائے بیجا

شیخ ناسخ ایک دولتمند شخص کے متبنّیٰ تھے۔ چچاؤں سے وراثت پر جھگڑا ہو کر شاہی عدالت تک پہونچا۔ وہ لوگ ان کو غلام قرار دیکر محروم کرنا چاہتے تھے فیصلہ شیخ ناسخ کے حق میں ہوا۔

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام
میراث پدر پائی مگر میں نے تمام
اس دعوئے باطل سے ستمگاروں کو
حاصل یہ ہوا، کر گئے مجھکو بدنام

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام
پر کرتے ہیں غور خواص اور عوام
وارث ہونا دلیلِ فرزندی ہے
میراث نہ پا سکا کبھی کوئی غلام

انقلابِ زمانہ

جب نواب اودھ کا دور ختم ہو کر انگریزی تسلط قائم ہوا۔ تو میر انیس کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا۔ ابھی اس انقلاب سے لکھنؤ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ ہنگامہ ۵۷ء برپا ہوا۔

انیس

افسوس زمانہ کا عجب طور ہوا
کیوں چرخِ کہن آج نیا دور ہوا
بس یاں سے کہیں اور چلو جلد انیس
اب یاں کی زمین اور فلک اور ہوا

دبیر

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا   کہہ عدل گیے ظلم گیے جور ہوا
اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر   کیا غم جو زمین اور فلک اور ہوا

انیس

کیوں کر دلِ غمزدہ نہ فریاد کرے   جب مُلک کو چرخِ پیر برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوند کریم   اُجڑی ہوئی مملکت کو آباد کرے

تعریف حیدرآباد دکن

۱۸۷۱ء میں مولوی سید شریف حسین خاں کی تحریک اور نواب تہور جنگ کی طلب پر میر انیس حیدرآباد گئے۔ جہاں پر ایک مجلس میں یہ رباعیاں پڑھیں

اللہ و رسولِ حق کی امداد رہے   سرسبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا، رئیسِ اعظم ایسے   یارب آباد حیدرآباد رہے

موجود ہے، جو کچھ جسے منظور ہے یہاں   علم و عمل و عطا کا دستور ہے یہاں
مختار الملک و نبرگانِ عالی   رحمت رحمت پہ، نور پر نور ہے یہاں

زمانہ گذر گیا۔ اور ۱۳۲۸ھ میں میر انیس کے نواسے میر رشید وہاں پہونچے نواب بہرام الدولہ کے یہاں ایک مجلس میں جب سابق حضور نظام تشریف لائے تو انھوں نے یہ رباعیاں پڑھیں۔

ماشاءاللہ ہے یہ خوب آباد
خوش وضع آباد، خوش اسلوب آباد
حضرت کے قدم سے پائی ہے یہ صورت
حیدرآباد ہے، محبوب آباد

طالع جو بلندی پہ ہمارے آئے
مہتاب کے ساتھ ماہ پارے آئے
ہیں جلوہ فگن شاہ بھی شہزادے بھی
خورشید کے ہمراہ ستارے آئے

معارف پروری

اعلحضرت مرحوم نے میر رشید کی حیدرآباد والی متعدد مجلسوں میں شرکت فرمائی اور رباعیاں لکھیں۔ جن میں چند میر صاحب کی جادو نگاری کی تعریف میں تھیں۔ جب ان کو پڑھنے کے لئے مرحمت ہوئیں۔ تو ہر رباعی کے بعد اپنا جواب بھی پڑھا۔

حضور نظام

مداحِ امام دوجہاں ہے یہ رشید
لاریب کہ اعجاز بیاں ہے یہ رشید
پیری میں نیا رنگ سخن کا دیکھا
میں کیا کہوں واللہ جواں ہے یہ رشید

رشید

پیری میں جواں بن کے دکھوں گا میں
اک جامہ نیا پہن کے دکھوں گا میں
حضرت نے جواں کہا، سنا تو نے فلک!
ہر بار تجھی کو تن کے دیکھوں گا میں

فراق وطن

شیخ ناسخ کو دوبار لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ پہلی مرتبہ نواب غازی الدین حیدر نے طلب کیا کہ دربار میں حاضر ہوکر قصیدہ پڑھو۔ تو ملک الشعرا کا خطاب ملے۔ مگر انھوں نے انکار کیا۔ جسپر حکم شاہی سے شہر بدر ہوئے۔

دوسری مرتبہ مختار السلطنت حکیم مہدی کشمیری کے معتوب ہوجانیپر انکی ہجو لکھی۔ جب وہ پھر بحال ہوئے۔ تو انکو لکھنؤ سے گریز کرنا پڑا۔ مگر تڑپتے ہی رہے۔

حیران بیٹھے ہیں گرد سارے مونس　　تصویر کی جس طرح کھنچی ہو مجلس
غربت میں ہوا ہے ضعف ایسا طاری　　نقطہ کی طرح ہوں دائرہ میں بے حس

غربت نے کیا ہے مجکو ایسا حیراں　　سطلق ہے خیالِ جاں نہ یادِ جاناں
ہے خالِ رُخِ یار مجھے نقطۂ سہو　　اور ابروئے خمدار لطاقِ نسیاں

کب دیکھئے ہوتا ہوں دوچارِ گلشن　　کس دن نظر آتی ہے بہارِ گلشن
غربت نے کیا ہے خارِ صحرا مجکو　　تھا پیش ازیں ہائے میں خارِ گلشن

نکلا ہوں وطن سے صورتِ بوئے چمن　　کس رنگ سے اب آئے نظر روئے چمن
مانند بدن وطن ہے میرا میں روح　　ممکن نہیں عَود روح کا سوئے بدن

حکایت و شکایت

ناسخ

احباب وطن میں ہیں اگر آسودہ
بے تاب میں غربت میں ہوں کیوں بیہودہ
غفلت ہے اگر جواب لکھنے میں انھیں
خامہ ہے مرا بھی پائے خواب آلودہ

ایضاً

بھیجا ہے جو میں نے یہ محبت نامہ
لکھا نہ جواب میں عنایت نامہ
یہ حال ہے دم بھر نہیں امید حیات
گویا کہ یہ نامہ ہے وصیت نامہ

ایضاً

دے نامہ بر آکے در پہ دستک یارب
پہونچے مرا مکتوب یکایک یارب
ہو وہ بھی گھڑی جو لوگ آآ کے کہیں
آیا خط یار ہو مبارک یارب

ایضاً

کرتا ہوں میں وحشت میں گریباں کو چاک
اور غم نے کیا سینۂ سوزاں کو چاک
ہوگا کوئی وہ بھی دن الٰہی کہ کروں
سر نامۂ مکتوب عزیزاں کو چاک

ایضاً

کیا اُمڈے ہیں اشک نامہ کی انشا میں
یہ جوش نہ گنگا میں ہے نہ جمنا میں
یوں قلزم اشک میں ہے نامہ میرا
دیتے ہیں عریضہ جس طرح دریا میں

ناسخ

لیکر جو گیا نامہ ہمارا قاصد ۔۔۔ کیا ذکر جواب، خود نہ آیا قاصد
مدت ہوئی انتظار کرتے کرتے ۔۔۔ تھا عمرِ گذشتہ شاید اپنا قاصد

ایضاً

وہ خط نہیں لکھتے تو ہو کیوں دلتنگی ۔۔۔ تازہ یہ زمانہ کی نہیں نیرنگی
ہم نے بھی کیا نامہ کا لکھنا موقوف ۔۔۔ اب اپنے قلم کو بھی ہے عذرِ لنگی

شاعر کا قلم

ناسخ

کیا نامہ لکھوں گراں ہے بارِ خامہ ۔۔۔ کچھ صرف دوات ہے نہ کارِ خامہ
کیا دور اگر سفید ہو چشمِ دوات ۔۔۔ مدت سے ہے اُس کو انتظارِ خامہ

ایضاً

ہے شمعِ شبستاں پہ گمانِ خامہ ۔۔۔ پھیلائی ہے تیرگی لسانِ خامہ
کالی راتوں کا حال کرتا ہے بیاں ۔۔۔ کیونکر نہ سیاہ ہو زبانِ خامہ

خیر مقدم

انیس

امید کسے تھی بزم کے بھرنے کی — اللہ جزا دے اس کرم کرنے کی
آنکھوں کو کہاں کہاں بچھاؤں نہ انیس — ملتی نہیں جا بزم میں تل دھرنے کی

دبیر

ہر عضو سے سربلند گو آنکھیں ہیں — پر فرش کی ہو کمی تو لو آنکھیں ہیں
کس کس کے بزیر پا بچھاؤں نہ دبیر — مشتاقِ بہت ہیں اور دو آنکھیں ہیں

بزم سخن

انیس
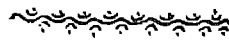
شہرہ ہر سُو جو خوش کلامی کا ہے — باعث مدحِ امامِ نامی کا ہے
میں کیا، آواز کیسی، پڑھنا کیسا — آقا یہ شرف تیری غلامی کا ہے

دبیر

ہر بند پہ بے فائدہ بتلانا ہے — اچھا نہ کہے گا اسے جو دانا ہے
ابنِ شہِ مرداں کا ثنا خواں ہوں میں — صد شکر کہ پڑھنا مرا مردانا ہے

انیس

کس منہ سے کہوں لائقِ تحسیں ہوں میں
کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں ہوں میں
ہوتی ہے حلاوتِ سخن خود ظاہر
کہتی ہے کہیں شکر کہ شیریں ہوں میں

دبیر

الہام کے گلزار کا میں گلچیں ہوں
شیریں سخنی سے موردِ تحسیں ہوں
شکر سے ہی شیریں سخنی کا شہرہ
شکر نہیں کہہ سکتی کہ میں شیریں ہوں

ایضاً

الہام کے گلزار کا میں گلچیں ہوں
شیریں سخنی سے موردِ تحسیں ہوں
شکر سے ہی شیریں سخنی کے آگے
کیا منہ جو کبھی کہے کہ میں شیریں ہوں

ایضاً

شیریں سخنی پہ موردِ تحسیں ہوں
واللہ نہ عیب بیں نہ نکتہ چیں ہوں
سکتہ میں ہیں میرے سخنِ شیریں سے
شکر کا ہے کیا منہ جو کہے شیریں ہوں

ایضاً

واللہ نہ خورد ہ بیں نہ خود بیں ہوں میں
الہام کے مضمون کا گلچیں ہوں میں
شیریں سخنی کا ہے مری شور بسیر
کیا منہ جو شکر کہے کہ شیریں ہوں میں

انیس

کس دن نئے مضموں کا نہ نقشہ اترا
پردۂ معانی کا نہ چہرہ اترا
منبر سے ہم اترے نئے مضموں لیکر
ان کے لئے گویا من و سلویٰ اترا

دبیر

بعضوں میں نہ فہم نکتہ دانی پایا تصنیف کا دعوا بھی زبانی پایا
دزدانِ معانی کے وہ شاکی ہیں بجا یعنی سخن اُن کا بے معانی پایا

انیس

کب دُزد سے دولتِ ہنر بچتی ہے لے بھاگتے ہیں جبکہ نظر بچتی ہے
ممکن نہیں دُزدانِ مضامیں سے نجات سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے

دبیر

سرقہ مضمون کا زبوں ہوتا ہے یعنی علمِ نظم نگوں ہوتا ہے
پر اُن میں جو مندرج ہے حالِ شہدا اس سے مرے مرثیوں کا خوں ہوتا ہے

انیس

مضمونِ انیسؔ کا نہ چہرہ اُترا اُترا بھی تو کچھ بگڑ کے نقشہ اُترا
نقاش نے سو طرح کی خفت کھینچی تصویر نہ کھینچ سکی تو چہرا اُترا

دبیر

کب غیر کے مضموں پہ خیال اپنا ہے الہامِ خدا شریکِ حال اپنا ہے
اک یہ بھی ہے اعجازِ ائمہ کا دبیر دنیا میں سخن سحرِ حلال اپنا ہے

ایضاً

ہے سُست کہ جسپت پہ کلام اپنا ہے لاریب خطاپوش امام اپنا ہے
جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں اُن مرثیہ گویوں کو سلام اپنا ہے

دبیر

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں؟
خلاقِ مضامیں تو سبھی ہیں، لیکن کھلجائے یہ عقدہ جو زباں بند کروں

انیس

گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں
ہیں باعثِ نغمہ سنجیٔ بلبل ہوں کھولے نہ کبھی منہ جو زباں بند کروں

دبیر

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں، گونجیں گے دکاریں گے جہاں بند کروں
خلاقیٔ مضموں کا ہے دعوا سب کو کھلجائے حقیقت جو زباں بند کروں

انیس

مشکِ ختنِ نظم کہاں بند کروں مہکے گا یہ آپ اس کو جہاں بند کروں
ہیں فاقہ کشائے سخن اس بزم کے لوگ دل ان کے کھلیں کب جو زباں بند کروں

انیس

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے دل میں وہ فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

دبیر

خود اپنے کلام کی ثنا کرتے ہیں غیروں پہ ثبوت یہ خطا کرتے ہیں
ان باتوں سے لب پہ قفلِ حیرت ہے دبیر کیا کہتے ہیں منہ سے اور کیا کرتے ہیں

انیس

کیوں زر کی ہوس میں آبرو دیتا ہے
ناداں یہ کسے فریب تو دیتا ہے
لازم نہیں اپنے مُنہ سے تعریف انیس
خالص جو ہے مشک آپ بو دیتا ہے

دبیر

بے علم شعارِ شعرا کیا جانے
اقسامِ کلامِ فصحا کیا جانے
تعریف اساتذہ نے کی ہے اپنی
جانے جو بُرا یہ، وہ بھلا کیا جانے

دبیر

جبریل سے ہم دادِ سخن لیتے ہیں
اظہارِ بد و نیک بھی سُن لیتے ہیں
جو طالبِ حق ہیں وہ بقولِ معصوم
باطل سے دبیر حق کو چُن لیتے ہیں

ایضاً

جو طبع رسا کہتی ہے سُن لیتے ہیں
نایاب گہر درِ سخن لیتے ہیں
مصرے ہیں جو تیس ہر مہینے میں دبیر
ہم مثلِ ہلال ایک چُن لیتے ہیں

انیس

نافہم سے کب دادِ سخن لیتا ہوں
دشمن ہو کہ دوست سب کی سُن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بوئے دوستانِ یک رنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چُن لیتا ہوں

دبیر

آغازِ سخن میں شورِ تحسیں ہو جائے
سرسبز ہر اک معنیِ رنگیں ہو جائے
ہے اپنے سخن میں حق و باطل کی تمیز
گلچیں یہاں آئے تو سخن چیں ہو جائے

دبیر

انجم نے شرف نورِ قمر سے پایا اور ماہ نے خورشیدِ سحر سے پایا
اس قافیہ و ردیف کا جلوہ دبیر جس نے پایا ہمارے گھر سے پایا

ایضاً

اے ابر تری گہر فشانی کیا ہے آ دیکھ کہ یہ دُرِ معانی کیا ہے
یہاں گُل ہے چراغ الوری کا بالکل اے شمع تری چرب زبانی کیا ہے

عشق

اے عشق طرفداروں کے دل صاف نہیں کہنا ہے بہت خوب پر انصاف نہیں
انصار سے کیا کام، کلام اچھا ہو گیسو کا نہیں عیب جو موباف نہیں

انیس

بلبل یہاں آ کے خوش بیانی سیکھے اندازِ فغاں مجھ سے نغانی سیکھے
رونا مری آنکھوں سے کرے حاصل ابر دریا مرے اشکوں کی روانی سیکھے

ایضاً

بندوں پہ کرم حضرتِ باری کا ہے، مقدور کسے شکر گذاری کا ہے،
دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجکو ثمرہ یہ نہالِ خاکساری کا ہے،

عشق

بیجا نہیں دل کو جو پریشانی ہے اس عہد میں کچھ طرفہ سخندانی ہے
نافہموں کو خوش آئے اگر تیغِ گلی کہدیں گے یہ شمشیرِ خراسانی ہے

انیس

بیجا نہیں مدحِ شہ میں غرّا سیرا　　بھرتی سے کلام ہے مبرّا سیرا
مرغانِ خوش الحانِ چمن بولیں کیا　　مرجاتے ہیں سُن کے رُوز مرّہ انیسؔ

ایضاً

پروائے تیغِ زباں کو سجنے کی نہیں،　　حاجت طبلِ سخن کو بجنے کی نہیں
دُربار ہے ابرِ طبع لیکن ہوں خموش　　عادت ہے برسنے کی گرجنے کی نہیں

دبیر

تائیدِ خدا باغ ہے، گلچیں ہم ہیں　　یعنی چمن آرائے بزم رنگیں ہم ہیں
قرآن و احادیث کی قوّت سے دبیرؔ　　مخلوق میں خلاقِ مضامیں ہم ہیں

ایضاً

تحصیل مری ہیچمدانی ہے فقط　　شیریں سخنی میں بے زبانی ہے فقط
نے واہ کے، نے آہ کے قابل ہے دبیرؔ　　بندے پہ خدا کی مہربانی ہے فقط

حالی

جوشِ خُمِ بادہ جامِ حالی میں ہوا　　پھر وَلوَلہ پیدا دلِ حالی میں ہوا
تسلیمؔ نے دی کچھ اس طرح دادِ سخن　　مجکو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

دبیر

جو علم معانی و بیاں کو سمجھے،　　البتہ دبیرؔ کی زباں کو سمجھے
کیا داد بلندیِ سخن اُس سے بھلا　　یکساں جو زمین و آسماں کو سمجھے

دبیر

جو نظم مسلسل ہے خوش اسلوب وہ ہے صحت ہو جس بیاں میں معیوب وہ ہے
اک طور کی تصنیف میں ہمکو ہے کلام ہر طرز میں جو خوب کہے خوب وہ ہے

اوج

چشم تنقیح جادواں بند ہوئی گویا رہ معنی و بیاں بند ہوئی
کھل جائیگا حال اہل جوہر اے اوج جس دن یہ زبان دُرفشاں بند ہوئی

دبیر

چشمک ہے کہیں اور کہیں سرگوشی ہے اظہار عیوب اور ہنر پوشی ہے
عاقل تیری گویائی کے قائل ہیں دبیر جاہل کا مگر جواب خاموشی ہے

ایضاً

دل تازہ ہے حیدر کی ثنا خوانی سے ہے کام زباں کو گہر افشانی سے
مچھلی ہے مری زباں اگر فرق یہ ہے زندہ ہے یہ منقبت سے وہ پانی سے

انیس

زیبا ہے وقار بادشاہی کیلئے جرأت واجب ہے کج کلاہی کیلئے
لازم ہے کہ ہو اہل سخن تیز زباں تلوار ضروری ہے سپاہی کیلئے

دبیر

سرسبز سخن برنگ باغ اپنا ہے ہر بزم میں روشن یہ چراغ اپنا ہے
سرور کی بدولت ہے یہ سب ناز دبیر اس پائے سے عرش پر دماغ اپنا ہے

سودا

سودا بجہاں اپنی زبانی تو ہے
آفاق میں خاقانیٔ ثانی تو ہے
گو نطق کا ہر چند نہیں تو خالق
پر نطق کا خلاقِ معانی تو ہے

ایضاً

سودا شعرا میں ہے بڑائی تجھکو
تشریف سخن عرش سے آئی تجھکو
عالم تجھے اس فن میں پیمبر سمجھا
پر جاہلا نے بخدائی تجھکو

دبیر

شہرہ جو میرے کلام کا ہر سو ہے
یہ باعثِ رشکِ حاسدِ بدخو ہے
یہ جوہرِ ذاتی ہے چھپاؤں کیونکر
خورشید میں روشنی ہے گل میں بو ہے

ایضاً

شیریں سخنی کے فن میں شہ زور ہو نہیں
پر بخت یہ کہتا ہے ارے شور ہو نہیں
اس ہند میں طوطیٔ قفس کے مانند
خوبی سے زباں کی زندہ درگور ہو نہیں

ایضاً

شیریں سخنی ہمیشہ کام اپنا ہے
حق کہنے سے ہاں تلخ کلام اپنا ہے
گو مرثیہ خوب نظم کرتے ہیں دبیر
پر کبر و غرور کو سلام اپنا ہے

ایضاً

طالع مرا یاور و مساعد نکلا
خامہ رقمِ تازہ کا موجد نکلا
ڈھونڈھا جو سہی تخلصِ بے نقطہ
ہمنام دبیر کا عطارد نکلا

انیس

کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے
کب تھمتے ہیں جو اشک ہیں ڈھلنے والے
اللہ رے تیرے سخن کی تاثیر انیس
رو دیتے ہیں مثلِ شمع جلنے والے

ایضاً

کچھ فرق کلامِ کہنہ و نو میں نہیں،
منصف ڈھونڈھوں تو ایک بھی سو میں نہیں
سمجھا لوں نہ کبھی گوہرِ مضموں بے قدر
انصاف فلک تیرے قلمرو میں نہیں

ایضاً

کس دن فرسِ خامہ تگ و دو میں نہیں
مجھسا بھی سیہ بخت کوئی سو میں نہیں
ہر چند کہ ہوں خسروِ اقلیمِ سخن
پر غیر دوات کچھ قلمرو میں نہیں

دبیر

کھلتے ہی زباں کے شورِ تحسیں ہو جائے
فی الفور شگفتہ طبعِ غمگیں ہو جائے
مدحِ گلِ زہرا میں جھڑیں منہ سے پھول
یہ بزم ابھی دامنِ گلچیں ہو جائے

اکبر

کھولی ہے زباں خوش بیانی کیلئے
اٹھتا ہے قلم گہر فشانی کیلئے
آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبر
نظارۂ شاہدِ معانی کیلئے

دبیر

کیا تیز زباں مدحتِ شبیر میں ہے
ہر علم کا جوہر مری شمشیر میں ہے
مرقوم ہے جس میں لقبِ یکتائی
وہ فرد مرے دفترِ تقدیر میں ہے

انیس

گُل سے بلبل کی خوش بیانی پوچھو ذی فہم سے لطفِ نکتہ دانی پوچھو
توقیرِ کلامِ حق سمجھتا ہے کلیم موسیٰ سے رموزِ لن ترانی پوچھو

ایضاً

لفظوں میں نمک سخن میں شیرینی ہے دعوئے ہنر نہ عیبِ خود بینی ہے
مدّاحِ گلِ گلشنِ زہرا ہوں میں غنچہ کی طرح زباں میں رنگینی ہے

دبیر

مصرے ہیں مرے نہال گلشن کیلئے اور خار ہیں چشم و دلِ دشمن کیلئے
ہے باعثِ آزارِ فروغ اپنا دبیر آفت ہے ہوا کی شمع روشن کیلئے

ایضاً

مضمون سے وہ معنئ پُر ضو نکلا ٹھنڈا جس سے قمر کا پر تو نکلا
ہر مصرعِ کہنہ کی چمک پر یہ غُل اٹھارویں تاریخ مہ نو نکلا

انیس

مضموں گوہر ہیں اور صدف سینا ہے ہے صاف تو یہ کہ قلب بے کینا ہے
آئینہ سے روشن ہے کلام اپنا انیس ہم اسکو نظر آئیں کہ جو بینا ہے

دبیر

معمول سے اپنے یہ حقیر آیا ہے سننے کو بھی انبوہِ کثیر آیا ہے
کیوں راہ میں بہکاتے ہیں مشتاقوں کو شاہد ہیں یہاں سب کہ دبیر آیا ہے

انیس

مملوِ دُرِ معنی سے مرا سینہ ہے　　دل میں یہ صفائی ہے کہ آئینہ ہے
جب قفلِ دہن کُھلا، جواہر نکلے　　گویا کہ زباں کلیدِ گنجینہ ہے

مونس

میزانِ سخن سنج میں تُلتا ہوں میں　　فکرِ مضمونِ نو میں گُھلتا ہوں میں
دل رہتا ہے بند قفلِ ابجد کی طرح　　جب حرف شناس ہو تو کُھلتا ہوں میں

انیس

نہ مدح کا دعوا ہے نہ خود بینی ہے　　باتوں میں اثر، زباں میں رنگینی ہے
شیرینی میں ہے نمک، حلاوت دیکھو　　ہے طُرفہ مزا نمک میں شیرینی ہے

دبیر

ہاں بلبل سدرہ شورِ تحسیں ہو جائے　　وہ نظم پڑھوں کہ بزم رنگیں ہو جائے
پھل نقطے ہوں، پھول حرف، طوبیٰ مصرے　　فردوسی اگر آئے تو گلچیں ہو جائے

ایضاً

ہے رزم سرا پا تو زباں اور ہی ہے　　اور بین کے مابین بیاں اور ہی ہے
کس درجہ بلند ہے تری فکرِ دبیرؔ　　کہتی ہے زمیں یہ آسماں اور ہی ہے

رشید

ہے عشق کا رنگ ہر سخن میں میرے　　لاکھوں گُلِ مضموں ہیں چمن میں میرے
مشتاق کلام انیس کا مجھ سے سنیں،　　گویا ہے زباں ان کی دہن میں میرے

دبیر

یہ لفظ یہ معنیٔ معیں دیکھے ہیں   منصف تو ہیں قائل کہ نہیں دیکھے ہیں
تجکو سرِ مضموں کی قسم ہے اے نظم   خوش فکر دبیر سے کہیں دیکھے ہیں

عشق

یکتا ہوں اگر فضلِ صمد ہو جائے   پھر کیا ہے اُدھر سے جو مدد ہو جائے
ہوں عشق میں عندلیبِ باغِ ناسخ   رد ہو وہ جسے مجھسے حسد ہو جائے

پیرانہ سالی و زندہ خیالی

حالی

حالی کو جو کل فسردہ خاطر پایا   پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی امید   وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

رشید

نامی ہوئے بے نشان ہونے کیلئے   افسانہ ہوئے بیان ہونے کیلئے
کی ہوت قبول خواہشِ جنت میں   ہم پیر ہوئے جوان ہونے کیلئے

گلدستۂ افکار

انیس

آدم کو عجب خدا نے رتبا بخشا اونا کے لئے مقام اعلا بخشا
عقل وہنر و تمیز و جان و ایماں اس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا

ایضاً

اپنوں کا گلہ نہ غیر ذالک کا ہے کیوں سعی نہ کی ؟ قصور سالک کا ہے
تعذیر دے یا عفو کرا ے ربِّ کریم مملوک پہ اختیار مالک کا ہے

حسن

ظاہر بھی تو ہے اور نہاں بھی تو ہے معنی بھی تو ہے اور بیاں بھی تو ہے
دونوں عالم میں تجھ سوا کوئی نہیں یاں بھی تو ہے اور واں بھی تو ہے

دبیر

یا بارِ خدا عام ہے انعام تیرا غفّار بھی ستّار بھی ہے نام تیرا
میں عذرِ گنہ کرتا ہوں تو رحمت کر وہ کام میرا ہے اور یہ کام تیرا

ایضاً

یارب جبروتی تجھے زیبندہ ہے ہر تن ترے سجدے میں سر افگندہ ہے
توحید کا کلمہ ہی پڑھتا ہے دبیر جو تیرے سوا ہے وہ ترا بندہ ہے

دبیر

اندامِ نبی نے کیا صفائی پائی سائے کی بھی وصل سے جدائی پائی
وہ سایہ ہوا دواتِ قدرت میں جمع لکھنے کو قضا نے روشنائی پائی

ایضاً

تسلیم نبی کو ہر سلیماں خم ہے خاتم ہے لقب زیرِ نگیں عالم ہے
سائے کی سیاہی نہ ہے کیوں کر دور خاتم ہے مگر نور کی یہ خاتم ہے

ایضاً

کیا روئے پیمبر نے ضیا پائی ہے فرقاں کی بلا فرق یہ زیبائی ہے
ہر شے سے مقدم ہے ہمیں اسکا ادب قرآن سے پہلے یہ کتاب آئی ہے

ایضاً

معراج نبی کو جو بصد زین ملی اوروں کو نہ وہ خواب کے مابین ملی
ہر گوشے سے فرمایا خدا نے لبیک قبضے میں کمانِ قاب قوسین ملی

انیس

افسوس یہ عصیاں، یہ تباہی دل کی کی خوب انیسؔ خیر خواہی دل کی
کپڑے اُجلے پہن کے نازاں ہوئے تم بڑھتی گئی دن رات سیاہی دل کی

ایضاً

انسان ذی عقل بیہوش ہوا جاتا ہے اور صاحبِ چشم و گوش ہوا جاتا ہے
گر جان نہیں سخن تو بتلائیے پھر کیوں مر کے بشر خموش ہو جاتا ہے

ذوق

اے ذوق کریگا کوئی دنیا کیا ترک
دنیا ہے بری بلا ارے کیسا ترک
کیا وخل کہ ہو ترک کسی سے دنیا
جب تک نکرے آپ اُسے دنیا ترک

دبیر

اعمال کی تیرگی وضو سے نہ گئی
ظلمت عصیاں کی شست وشو سے نہ گئی
پیری آئی، جوانی گذری، افسوس!
بالوں سے سیاہی گئی رو سے نہ گئی

سودا

اے شیخ حرم تک تجھے جانا آنا
یہ طوف جلاہے کا ہے تانا بانا
پہچانیگا واں کیا اُسے، حیراں ہوں میں
جسکو حرمِ دل میں نہ تو پہچانا

مونس

انجام پہ اپنے آہ و زاری کر تو
سختی بھی جو ہو تو بردباری کر تو
پیدا کیا خاک سے خدا نے تجھکو
بہتر ہے یہی کہ خاکساری کر تو

حالی

آہیں پیری میں شیخ بھرتے نہیں یوں
دل دیتے ہیں پر جی سے گذرتے نہیں یوں
سنتے تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا
جو جیتے ہیں اسطرح وہ مرتے نہیں یوں

ذوق

اے زاہد تمسے کیا جھگڑا کروں میں
غصہ سے کروں کسلئے دل کو خوں میں
میخوار و صنم پرست کہتے ہو مجھے
تم ہو تم ہو، جو کچھ کہ ہوں میں ہوں میں

ذوق

ان آنکھوں نے روئے لالہ گوں بھی دیکھا　　اور پھر انکو پُر اشکِ خوں بھی دیکھا
کیا کیا دیکھے نہ رنگ ہم نے اے ذوقؔ　　یوں بھی دیکھا جہاں نہیں دوں بھی دیکھا

میر

اب صوم و صلوٰۃ سے ہوا جی بیزار　　اب درود و وظائف سے کیا استغفار
عقدے نہ کھلے دل کے بسانِ تسبیح　　اسمائے الٰہی بھی پڑھے سو سو بار

سودا

اے صورتِ انساں حقیقت میں خر　　دے سفلہ کو تیر طلب پوچ و لچر
زر سے ہے کہ ذمہ کے خریطے کی قدر　　ہے پوچ خریطہ جو نکل جاوے زر

حالی

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی　　بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

دبیر

پرہیز نہیں گنہ سے دردا دردا　　آرام کی امید ہو کیوں کر تَر درد
محشور ہوں فردِ فرد جس دم جزو کل　　رب ارحمنی ولا تذرنی فردا

ایضاً

پیشِ امرا طالب زر جھکتے ہیں　　سجدے سے سوا جھکے ہیں سر جھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی مثال　　ہے مال جدھر سوا اُدھر جھکتے ہیں

میر

تسبیح کو مدتوں تو سنبھالا ہم نے خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخر عمر میری کی خاطر سے سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

دبیر

جو قہر کرے حرص کو قیصر وہ ہے، تکیہ ہے جسے حق پہ تونگر وہ ہے
آئینہ سکندر نے بنایا تو کیا، دل جسکا ہے آئینہ سکندر وہ ہے

مومن

پھر چہرے ہوئے سرخ سیہ کاروں کے نوروز ہے، دن پھرے گنہگاروں کے
بے وجہ نہیں کہ ابرِ رحمت ہے سیاہ دھوئے ہیں مگر گناہ میخواروں کے

تسلیم

تسلیم غم جو صلہ فرسا کہیے یا روزِ تمنا کی تمنا کہیے
سر پر ہے اجل، دم ہے لبوں پر اپنا اس کشمکشِ نزع میں کیا کیا کہیے

نصیر

جو اشک کہ آنکھوں سے جدا ہوتا ہے مژگاں تلک آیا کہ فنا ہوتا ہے
آنکھوں سے کسی کے کوئی یارب نہ گرے آنکھوں کا گرا بہت برا ہوتا ہے

جرأت

جو عیب تھا سو ہے اب زمانہ میں ہنر نیکی تو ہے کم بدی ہے زیادہ تر
ادلے بدلے نہ سمجھے بوجھ کوئی یہ آخری دور پڑے ہیں پتھر

دبیر

جو چاہیں بزرگوار ارشاد کریں ہم کس لئے گھر حیا کا برباد کریں
اس واسطے بھولا ہوں بدی کو بھی مر جاؤں تو نیکی سے مجھے یاد کریں

میر

حسن ظاہر بھی ہے ہمارا دل خواہ محو صورت بھی ہوئے ہیں معنی آگاہ
باغِ عالم کو چشمِ کم سے مت دیکھ کیا کیا رنگ ہیں یہاں بھی اللہ اللہ

ایضاً

حاصل نہیں دنیا سے بجز دلریشی رکھتی نہیں اعتبار یاری خویشی
توفیق رفیق ہو تو سب کر کے ترک ہے جی میں کہ یکچند کریں درویشی

دبیر

حاصل یہاں نقدِ آرزو ہوتا ہے قطرہ دریا سے آبرو ہوتا ہے
جھکتا ہے جو رو سیاہ تو مثلِ نگیں اُٹھتے اُٹھتے سفید رو ہوتا ہے

ایضاً

خامہ بھی مری طرح سیہ کار نہیں یہ مشقِ کہن کسی کو زنہار نہیں
گر خوف نہ ہو برابری کا تو صاف کہوں مجھ سا عاصی خدا سا غفار نہیں

غالب

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی بیتابیٔ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلی افسوس! تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

ذوق

دل جنکا ہے آہن کی طرح سخت و سیاہ وہ لطفِ سخن سے نہیں ہوتے آگاہ
بد اصل کو کیا نامِ خدا کوئی بتائے بن ذوق کا طوطا نہ کہے حق اللہ

انشا

دین و دنیا و نام و عزّ و تمکیں تسکینِ دل و قناعت و صبر و یقیں
مخلوق کو اپنی تو نے سب کچھ بخشا اللہ اگر ہم ترے بندے ہی نہیں؟

انیس

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے مانند حباب ہستیٔ انساں ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس بادِ مراد سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے

میر

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے دل مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے
تھا چشمۂ آبِ زندگانی نزدیک پُر خاک سے اسکو بھر دیا ہے میں نے

انیس

دل سے دنیا کے ولولے جاتے ہیں اک آن میں طوبیٰ کے تلے جاتے ہیں
ہے راہ بہشت کتنی ہموار انیس بند آنکھیں کیئے لوگ چلے جاتے ہیں

میر

راضی ٹک میر آپ کو رضا پر رکھئے مایل دل کو تنک قضا پر رکھئے
بندوں سے تو کچھ کام نہ نکلا اے میر سب کچھ موقوف اب خدا پر رکھئے

انیس

راحت کیا حاسدوں سے حاصل ہوتی لذت دنیا کی زہر قاتل ہوتی
اس وقت میں گر خضر و مسیحا ہوتے دو چار گھڑی بھی زیست مشکل ہوتی

دبیر

زر دار نہیں ہیں طلب زر بھی نہیں میں بے سر و پا کسی کا ہمسر بھی نہیں
پھر خاک میں مجھکو کیوں ملاتا ہے فلک میں کون ہوں خاک کے برابر بھی نہیں

انیس

سوزِ غم دوری نے جلا رکھا ہے آہوں نے کنول دل کا بجھا رکھا ہے
نکلو کہیں جلدا عمر آخر ہے انیس اس ہند سیہ بخت میں کیا رکھا ہے

دبیر

صحرائے عدم سے خضر آگاہ نہیں اس راہ میں روح تک بھی ہمراہ نہیں
صحت میں مرض میں رنج و راحت میں دبیر بندے کا کوئی سوائے اللہ نہیں

مونس

ضائع نہ کر آغوش کے پالے دل کو کرتے ہیں پسند درد والے دل کو
منظور اگر ہے زادِ راہِ عقبیٰ سب چھوڑ کے دنیا سے اٹھا لے دل کو

میر

طاعت میں جو جواں ہوتے تو کرتے تقصیر وہ سر میں نشہ نہیں ہوئے ہیں اب پیر
اب کے روزوں میں یوں سنا ہے ہمنے پیتے ہیں بیٹھے معتکف ہو کر میر

دبیر

عاشق ہے ہر اک پیر وجواں بیٹے کا
ماں باپ کا ہے نام النشاں بیٹے کا
سب کچھ ہو بشر کے لئے صدمہ الآ!
اللہ نہ دے داغ جواں بیٹے کا

انیس

غافل تجھے کیوں خواہشِ دنیائے دنی ہے
پیوندِ زمیں ہر کوئی درویش وغنی ہے
جو قاقم وسنجاب پہنے تھے ہمیشہ
سوتے ہیں تہ خاک گلے میں کفنی ہے

جرأت

کس سے جرأت ملال دل کا کہیے
کس سے ہو نا نڈھال دل کا کہیے
سب اپنے ہی اپنے غم میں حیراں ہیں یاں
کوئی نہیں کس سے حال دل کا کہیے

سودا

کتنوں کا جہاں میں زر ومال ہے شکر
کتنوں ہی کا یا دولت واقبال ہے شکر
یوں شکر تو سب کرتے ہیں لیکن سودا
شاکر ہے وہی جسکو بہر حال ہے شکر

مجروح

کھویا دنیا سے بدشعاری نے مجھے
شرمندہ کیا گناہ گاری نے مجھے
ہوں غوطہ زناں بحر خجالت میں سدا
کچھ پاک کیا ہے شرمساری نے مجھے

انشا

کافر یہ کہے ہے حق پرستی سے گذر
ناصح کہتا ہے جوشِ ہستی سے گذر
انشا مجھ سے لیجھڑا ہیں دونوں لوچ
جھگڑا کہیں چھوٹے اپنی ہستی سے گذر

انیس

کھنچے ہوئے سر کو تو کہاں پھرتا ہے — پیری میں بشکل نوجواں پھرتا ہے
عرصہ ہے جہاں کا اس قدر تنگ و حقیر — خم ہو کے زمیں پہ آسماں پھرتا ہے

ظہیر

کب لاؤ نعم کا ہم کو مقدور ہوا — وہ تو نے کیا تجھے جو منظور ہوا
جس بار کشی سے ہیں فرشتے معذور — انسانِ ضعیف اُس پہ مامور ہوا

مہر

کیا چاہئے اب پئے نقاہت تنقیح — ہے ضعف سے جسم زار شکل تشریح
بہتر ہے کہ تو ہی ہو معالج میرا — ہوں مہر میں شاعروں میں تو طبیبوں میں مسیح

مومن

کیا ڈر ہے اگر نیند نہ آئی یک چند — بیخوابی ہر روزہ سے میں ہوں خرسند
معلوم ہوا ابھی خدا کو میرے — منظور نہیں کہ میری آنکھیں ہوں بند

ایضاً

کہتا ہوں میں یہ بات بتعلیم سروش — کر لے جسے تسلیم ہر اک صاحب ہوش
مدت سے کہے نہیں جو تم نے اشعار — تپ کا نہیں یہ گرمئ مضموں کا ہے جوش

میر

کچھ میر تکلف تو نہیں اپنے تئیں — ان روزوں نہیں پاتے کہیں اپنے تئیں
اب جی تو بہت ہی تنگ آیا اے کاش! — جا دیں ہم چھوڑ کر کہیں اپنے تئیں

میرؔ

کیا میرؔ کا مذکور کریں سب ہے جہل
پایا ہم نے اسے نہایت ہی سہل
ایسوں سے نہیں مزاج اپنا مانوس
وحشی، بیطور، بدزبان، نااہل

ذوقؔ

کھلتا نہیں اے ذوقؔ یہ ہم پر مضمون
ہر شخص جو مذہب کا ہے اپنے مفتون
کہئے کسے حق پہ اور باطل پہ کسے
کل حزب بما لدیہم فرحون

صباؔ

کیا خوب مزاج کا طریقہ ہے واہ
گہہ خضر، گہے رہزنِ گم کردہ راہ
اے بندہ نواز یہ تلون کیسا
لَا حَولَ وَلا قوۃ اِلا باللہ

امیرؔ مینائی

کیا لطف اگر سارا زمانہ دیکھے
دیکھے تو نگاہ چشم دانا دیکھے
کر گلشنِ الفت میں گزر مثلِ نسیم
آنا دیکھے نہ کوئی جانا دیکھے

مجروحؔ

گاہے تو طریقِ حق پہ چلتا ہوں میں
گہ صورت خوب پر پھسلتا ہوں میں
ہوں گامزنِ حیات لیکن اس طرح
گرتا ہوں کبھی کبھی سنبھلتا ہوں میں

دبیرؔ

گھر چھوڑ کے بہرِ جستجو نکلیں گے
گلزارِ جناں سے مثلِ بو نکلیں گے
اس چاہ میں گرتے تو ہیں بصورت دلو
پر نکلیں گے جب بہ آبرو نکلیں گے

انیس

گو صورت دریا ہمہ تن جوش ہو نہیں	لب خشک ہیں چشم تر ہے خاموش ہو نہیں
کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا	مانند حباب خانہ بر دوش ہو نہیں

تسلیم

گلبرگ نہ تھے اشاد جو دم بھر ہوتے	شبنم بھی نہ تھے داغ جو رو کر دھوتے
قسمت نے بنایا تھا لب چشم حباب	کیا حال پر اپنے ہم کبھی ہنستے روتے

جرأت

گہ آتش درد و غم میں جلیے بھنیے	گاہے مانند شمع سر کو دھنیے
سر تا بقدم زبان ہو جی لیکن	کچھ منہ سے نہ کہیے اور سب کی سنیے

مومن

لکھا نہ گیا اگرچہ دفتر لکھا	لکھا وہی بالکل کہ ہے دل پر لکھا
حیراں ہوں کہ جو حال پریشاں ہے مرا	یہ کاتب تقدیر نے کیوں کر لکھا

انیس

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے	رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر	میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

میر

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا	میخانے میں جوش بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشہ عافیت جہاں میں ہم نے	دیکھا تو محلہ خموشاں دیکھا

مومن

مومن لازم ہے وضع مرغوب ہے — جو رنگ ہو آدمی خوش اسلوب بنے
کیا خرقہ و عمامہ ہے اللہ اللہ — جب شکل بگڑ گئی تو تم خوب بنے

ایضاً

مظہر سے بڑی ہے کبریائی اس کی — آئینہ گداز ہے خود نمائی اس کی
وہ بندۂ نفس جو انا اللہ کہے — زیبندہ اسی کو ہے خدائی اس کی

میر

ہستی نہ کرا سے میر اگر ہے ادراک — داماں بلند ابر سمطار رکھ تو پاک
ہے عاریتی جامۂ ہستی تیرا — ہشیار کہ اس پہ نہ پڑے گرد و خاک

درد

پیدا کرے ہر چند تقدس بندہ — مشکل ہے کہ ہو حرص سے دل بر کندہ
جنت میں بھی اکل و شرب سے کب ہے نجات — دوزخ کا بہشت میں بھی ہوگا دھندہ

میر

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے — نازاں اس کو کمال پہ بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق — خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

درد

گر معرفت کا چشم بصیرت میں نور ہے — تو جس طرف کو دیکھیے اسکا ظہور ہے
آتی ہے دل میں اور ہی صورت نظر مجھے — شاید یہ آئینہ بھی کسی کے حضور ہے

داغ

نواب نے کی جو قدردانی میری — اے داغ گذر گئی جوانی میری
لیکن یہ خبر نہ تھی کہ وقت پیری — مر مر کے کٹے گی زندگانی میری

نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم

میر

ہر چند کہ طاعت میں ہوا ہے تو پیر — پر بات مری سُن کہ نہیں بے تاثیر
تسبیح بکف پھرنے سے کیا کام چلے — منکے کی طرح دل نہ پھرے جبتک میر

ایضاً

ہم میر برے اتنے ہیں وہ اتنا خوب — متروک جہاں ہم ہیں وہ سبکا محبوب
ممکن ہو اُسے وجوب کا جب رتبہ — ہے کچھ بھی مناسبت کا باہم اسلوب؟

مومن

ہے بزم طرب میں اور ہی پامالی — مستی نے نئی خلش یہ دل میں ڈالی
حسرت سے فلک کو دیکھکر کہتا ہوں — یارب! یہ سپہر کیا ہے کس نے بنا لی؟

غالب

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے — کرتے ہیں درنگ کام کرنیوالے
کہتے ہیں کہیں خدا سے، اللہ اللہ — وہ آپ ہیں صبح و شام کرنیوالے

انشا

ہے اُنس مجھے تو سب سے ہے کس سے بیر؟ — کعبہ میں بہت رہا ہے اب قصدِ دیر
اے زاہد و برہمن - نہیں ہے کچھ فرق — یہ بھی ایک سیر ہوگی، وہ بھی ایک سیر

انیس

ہر برگ سے قدرتِ احد پیدا ہے
ہر پھول سے صنعتِ صمد پیدا ہے
سینہ ہے بشر کا وہ محیطِ ذخّار
ہر اک نفس سے جزر و مد پیدا ہے

ایضاً

ہر دم ہے خیالِ عذر خواہی دل میں
مطلق نہیں کچھ خوفِ الٰہی دل میں
نافے کی طرح خطا میں گذری سب عمر
بالوں پہ سپیدی ہے سیاہی دل میں

انشا

ہر چند کہ ہیں بحسب ظاہر ہم کم
حق ہم میں ہے اور حق میں الحق ہیں ہم
باور جو نہ ہووے زاہدوں کو دیکھیں
پتلی میں ہے آنکھ کی یہ سارا عالم

انیس

ہو خاک کہ ذرا امید آزادی میں
حاصل ہو بلندی تجھے بربادی میں
آساں نہیں کچھ طریقِ عشقِ معبود
[illegible] تجھے اس وادی میں

حالی

ہوں یا نہ ہوں پیر اہلِ عرفان و یقیں
پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہوں نادان کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی
اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

امیر مینائی

ہے آپ کا اخلاق جو ہمدرد مرا
رشکِ دمِ عیسیٰ ہے دمِ سرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری
درماں مرے حق میں ہو گیا درد مرا

آواز

عشرۂ محرم میں میر انیس اور مرزا دبیر کو بڑی بڑی مجلسیں متواتر پڑھنی پڑتی تھیں۔ جس کے باعث آواز بیٹھ جاتی تھی۔

دبیر

طوطیٔ زباں زمزمہ پرداز نہیں انجام نہیں سخن کا آغاز نہیں
تغیر ہوئی پیاس سے آواز حسینؑ مداح کے قابو میں بھی آواز نہیں

انیس

ہر چند کہ خستہ و حزیں ہے آواز پر تعزیہ دارِ شاہِ دیں ہے آواز
نکلے نہ اگر کنجِ دہن سے تو بجا ماتم کے ہیں دن سوگ نشیں ہے آواز

خوان نعمت

اکبر

اس پیڑ میں خوب کٹھل آئے ہیں ہر شاخ میں پانچ سات پھل آئے ہیں
اکبر نے کہا کہ ہم غریبوں کے لئے نیچر کی طرف سے پارسل آئے ہیں

غالب

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

نصیر

اے نیّرِ برجِ آسمانِ اقبال — ان رنگتروں پہ غور سے کیجے گا خیال
یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر — پردے میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

غالب

بھیجی ہے جو مجکو شاہِ جم جاہ نے دال — ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال — ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

اکبر

عمدہ مچھلی مسلم و تمام ملی — تحفہ پایا مراد خدام ملی
ممنونِ کرم کیوں نہ ہوا اکبر تو — وہ دام میں لائے تجھکو بے دام ملی

حالی

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں — جو دیکھ کے، چکھ کے کہ بھائے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے بے شک — جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

فکاہات

نواب اودھ نے اہل دفتر کو حکم دے رکھا تھا کہ بالکل صاف اور خوشخط لکھا کریں۔ ورنہ فی غلطی ایک روپیہ جرمانہ۔ اُن میں ایک دفتری منشی سجن نامی تھے۔ وہ بیچارے اجناس میں سین لکھنا بھول کر اجنا لکھ گئے۔ اور اُن کی یہ غلطی نواب نے پکڑ لی۔ اُنھوں نے اپنی منطق سے عجیب انوکھی تاویلیں کیں اور کتب لغات سے اجنا کا مفہوم بھی صحیح ثابت کیا کچھ قواعد سے ترخیم میں لے گئے سید انشا کو خوب شگوفہ ہاتھ آیا۔

اجناس کی جا لکھا جو اجنا لہرا گھر آیا لغت کا ایک بادل گہرا
تصویر ملھار کی دکھائی پھر تو تفصیل نہ ٹھہری ہار اگ مالا ٹھہرا

اجناس کی فرد پہ یہ اجنا کیسا یہاں ابر لغات کا گرجنا کیسا
گو ہوں اجنا کے معنے جو تیز اوگے لیکن یہ نئی اوپج یا ادبجنا کیسا

اجناس لگے ہوتے میں اجنا دیکھو سلمائے علوم کا ہے یہ سجنا دیکھو
اجنا چیز لیست کاں بروپا ہے زمیں یہ تخم لغت کا نو اپجنا دیکھو

ترخیم کے قاعدے سے سجنا لکھئے اور لفظ خرد جنا کو جنا لکھئے
گر ہم کو اجی نہ لکھئے ہووے لکھنا تو کرکے مرخم اس کو اجنا لکھئے

دستار لغت تمہیں نہ سجنا آیا اجناس ہیں کو دکیوں کر اجنا آیا
اجنا کوئی ڈھول و دل والا ہوگا! کاغذ میں کہاں سے ڈھول بجنا آیا

لطیفہ

نواب نے لب دریا ایک حویلی پر لکھا دیکھا ؎

حویلی علی نقی خان بہادر کی

کہا کہ انشا دیکھو کسی نے تاریخ کہی مگر نظم نہ کر سکا۔ اسے رباعی کردو۔ فی البدیہہ عرض کی :-

نہ عربی، نہ فارسی، نہ ترکی نہ سم کی، نہ تال کی، نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لڑکی، حویلی علی نقی خاں بہادر کی

روزہ داری

غالب

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

داغ

کیا جانے کوئی زاہدوں کی گھاتوں کو　　تمییز ذرا چاہیئے ان باتوں کو
دن کیوں نہ بڑھے رات نہ کیوں کم ہو　　روزوں کے عوض کھاتے ہیں یہ راتوں کو

ٹیکس

اکبر

افسوس ہے بدگماں کی آزادی پر　　خالق کبھی خوش ہوگا نہ بربادی پر
طاعون سے کیوں ہے اتنی وحشت اکبر　　یہ تو اک ٹیکس ہے اس آبادی پر

حالی

واعظ نے کہا وقت سب جاتے ہیں ٹل　　اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل
کی عرض ایک سیٹھ نے اٹھ کر کہ حضور　　ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل

مطائبات

اسمٰعیل

بیکار نہ وقت کو گذار و یارو　　یوں سست پڑے پڑے نہ ہمت ہارو
برسات کی فصل ہیں ہے ورزش لازم　　کچھ بھی نہ کرو تو مکھیاں ہی مارو

ناسخ

پاتا ہے جو گوشمال کوئی انساں　　ہو جاتی ہے بند شرم سے اسکی زباں
آگے سے زیادہ ہوئی اس کی آواز　　طنبور کی طرح کیا اینٹھے گئے کاں

حالی

پوچھا جو کل انجامِ ترقیٔ بشر — یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہیگا کوئی انساں میں عیب — ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

ناسخ

رہنے کو عجب مکاں ملا ہے اے یار — ہر سمت سے خاک آتی ہے لیل و نہار
کرتا ہوں کسی خط میں اپنی نامہ تحریر — ہو جاتا ہے لکھنے کے بعد خطِ غبار

انشا

کیا ہاتھ ہلا کے پوچھتے ہو "ہے خوش؟" — ہم جیسے ہیں خوش کبھی نہ ہوگا کے خوش
بس ٹپکی ہی پڑتی ہے نشہ کی دھن میں — مے پی کے مزاج ہو رہا ہے بے خوش

سودا

کوتاہ نہ عمرِ مے پرستی کیجیے — زلفوں سے تری دراز دستی کیجیے
ساقی جو نہ ہو شراب لے آج وہ ابر — پانی پی پی کے فاقہ مستی کیجیے

انشا

لی چیکے سے میں نے جبکہ چٹکی — بولے کہ "پڑے جان پہ تیرے پھٹکی"
پھر دانت تلے کھٹک کے ناحق یہ کہا — بس چل بے! اب آشنائی تجھ سے کھٹکی

اکبر

لے لے کے قلم کے لوگ بھالے نکلے — ہر سمت سے بیسیوں رسالے نکلے
افسوس کہ مفلسی نے چھاپا مارا — آخر احباب کے دوالے نکلے

اکبر

محتاج در وکیل و مختار ہیں آپ سارے علے کے ناز بردار ہیں آپ
آوارہ و منتشر ہیں مانندِ غبار معلوم ہوا مجھے زمیندار ہیں آپ

انشا

میں نے جو کہا اس سے یہ رو رو کے آہ صد حیف کہ دل سے دل نہووے آگاہ
وہ ہاتھ کو پھیر اپنے منہ پر بولا سمجھوں گا بھلا میں تجھسے انشاء اللہ

ایضاً

جنت کے فواکہ ہیں روپیے پیسے یوں سمجھوں ہوں نصیبوں میں اگر اپنے ہوں
جو لذت و لطف چاہو ان سے لے لو طوبیٰ کے یہ پھل ہیں یہ پھر جوں کے توں

سودا

گر ہجو مرے کہنے سے اس پر ہو نگاہ تا یہ کہ مجھے جانلے سب خلق اللہ
سو وہ ہم تمہارا ہے میں اور آپکی ہجو لَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ

سلسلہ نمبر ۵

افسانۂ عبرت

نیرنگئی دہر
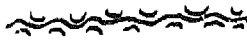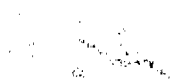
ظہیر

آنکھوں سے جہاں میں آکے کیا کیا دیکھا
شادی و ملال و زشت و زیبا دیکھا
لازم ہے نشیب ہر بلندی کے لئے
اونچا جو ہوا ہے اُس نے نیچا دیکھا

مومن

آوارہ ہے سب خلق بُرا دَور ہے یہ
پھرتے نہیں دن کبھی انیا دور ہے یہ
چکّر میں ہے چرخ اور تو ہے بدنام
اے گردشِ روزگار کیا دور ہے یہ

امیر

اتنے ہی جو ہم خراب ہوتے رہتے
کاہیکو غم والم سے روتے رہتے
سب خوابِ عدم سے چونکنے کے ہیں وبال
بہتر تھا یہی کہ وہیں سوتے رہتے

مہر

افسردگی طبعِ مضمحل میں دیکھی
انساں کی کدورت آب و گل میں دیکھی
دل صاف نہ دیکھا ہنسنے کوئی اے مہرؔ
یاں خاک ہی اُڑتی سب کے دل میں دیکھی

انیس

انجام بخیر ابتدا بگڑی ہے
گرگر نہ پڑے کہیں بنا بگڑی ہے
کشتی سے انیسؔ ہم کنارے ہوجائیں
الٹا دریا بہا، ہوا بگڑی ہے

دبیر

انسان اگرچہ لاکھ تدبیر کرے، کیا دخل کہ انقلاب تقدیر کرے
نیک پیری و صد عیب، مثل ہے مشہور پھر قدرِ ہنر کیا فلکِ پیر کرے

انیس

انساں بھی کچھ اس دور میں پامال نہیں سچ ہے کوئی آسودہ و خوشحال نہیں
اندیشۂ آشیاں و خوفِ صیاد مرغانِ چمن بھی فارغ البال نہیں

میر

ایسا نہ ہوا کہ ہم نے شادی کی ہو یا سیرِ بہارِ باغ و وادی کی ہو
پژمردہ کلی کے رنگ اس گلشن میں غالب ہے یہی کہ نامرادی کی ہو

حالی

بس بس کے ہزاروں گھر اجڑ جاتے ہیں گڑ گڑ کے علم لاکھوں اکھڑ جاتے ہیں
آج اسکی ہے نوبت تو کل ہے اسکی باری بن بن کے یوں ہی کھیل بگڑ جاتے ہیں

تسلیم

بیکار ہیں پیچ ہی کی بات گذری ہر دم سر سر گشتہ پھراتے گذری
تسلیم بگولے کی طرح صحرا میں دن رات عبث خاک اڑاتے گذری

داغ

بیگانہ یہاں ہر اک یگانہ دیکھا اپنے مطلب کا سب زمانہ دیکھا
جس کو دیکھا غرض غرض کا اپنی دنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا

تسلیم

تسلیم با غم دوست گوارا نہوا		دشمن سے کبھی کچھ ہمیں پیارا نہوا
افسوس زر و مال سے، جان و دل سے		ہم سب کے ہوئے کوئی ہمارا نہوا

دبیر

تقدیر زبردست ہے، کمزور ہیں سب		زحمت کشِ روزگار رشکور ہیں سب
اے چرخ ترے گنبدِ گرداں کے تلے		کیا خاک مزا ہے زندہ درگور ہیں سب

ایضاً

تکلیف دکھاتا ہے زمانہ ہمکو		دیتا ہے نہ دولت، نہ خزانہ ہمکو
او گردشِ افلاک، ہم سمجھتے ہیں تجھے		تو پیستا ہے جان کے دانہ ہمکو

انیس

چل جلد اگر قصد سفر رکھتا ہے		تو کچھ بھی مآل کی خبر رکھتا ہے
راحت دنیا میں کس نے پائی ہے انیسؔ		رکھتا ہے جو سر، درد سر رکھتا ہے

ایضاً

دنیا جسے کہتے ہیں بلا خانہ ہے		پامال ہے جو عاقل و فرزانہ ہے
مابین زمین و آسماں یوں ہم ہیں		جیسے دو آسیا میں ایک دانہ ہے

عشق

دنیا سے محبت کا شعار اٹھتا ہے		سینوں سے دھواں تیرہ و تار اٹھتا ہے
اے عشق نہ چھپ جائے کدورت دل پہ		آئینہ چھپاؤ کہ غبار اٹھتا ہے

داغ

دنیا میں کب انسان کی حاجت نکلی   حسرت ہی رہی، کوئی نہ حسرت نکلی
جیتے تھے قیامت کی توقع پر ہم   خود وقت کی محتاج قیامت نکلی

انیس

دنیا میں نہ چین ایک ساعت دیکھا   برسوں نہ کبھی روزِ فراغت دیکھا
راحت کا مکاں امن کا گھر، خانۂ عیش   دیکھا تو جہاں میں کنجِ عزلت دیکھا

دبیر

دنیا زنداں ہے، جائے آرام نہیں   گہوارہ بجز گردشِ ایام نہیں
آنکھوں میں سپیدی و سیاہی کی طرح   جھپکی جو پلک صبح نہیں، شام نہیں

انیس

راحت کا مزا عدوئے جانی نکلا   دل سے نہ کبھی غمِ نہانی نکلا
پیاسے رہے، آ کے چاہِ دنیا پہ انیس   نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

ناسخ

ہے روزِ ازل سے دانہ زدیہ دوراں   کیا خاک ہو سیر کوئی اس کا مہماں
خورشید کو دیکھو آسماں کو دیکھو   اتنے بڑے خوان میں ہے اک گردۂ ناں

دبیر

شطرنج دو رنگی سے ہیں ششدر بندے   آوارہ ہیں شہر شہر در در بندے
اے بندہ نواز ہے تعجب کا محل   تو مالکِ ملک اور بے گھر بندے

دبیر

سیارہ سے چشمِ مہر نادانی ہے
اس دور میں دل بھی دشمنِ جانی ہے
مشکل ہے کہ ہاتھ آئے عنانِ آرام
شبدیزِ فلک ستارہ پیشانی ہے

انیس

فردوس ہر اک قبر کا کونا ہوگا
مخمل ہمیں خاک کا بچھونا ہوگا
راحت دنیا میں غیر ممکن ہے انیس
آرام سے ہاں لحد میں سونا ہوگا

ایضاً

کانوں میں سدا حرفِ پریشانی ہے
دیکھا ہے جدھر اُدھر کو ویرانی ہے
مشہور علاجِ دردِ سر ہے صندل
یاں خاکِ لحد صندلِ پیشانی ہے

ایضاً

کس جسم پہ بل کروں کہ شہزور ہوں میں
دیکھو کہ ضعیف صورتِ مور ہوں میں
تن پر یہ پڑی ہے گردِ بازارِ کساد
ہوتا ہے یقیں کہ زندہ در گور ہوں میں

دبیر

کس دل کو نہیں فکرِ تن آسانی ہے
پر عاقبت کار پشیمانی ہے
مشکل ہے کہ ہاتھ آئے عنانِ آرام
شبدیزِ فلک ستارہ پیشانی ہے

ایضاً

کوشش سے سوا فقِ ہوز مانا معلوم
قسمت سے زیادہ رزق پانا معلوم
مانندِ مژہ کھڑے رہو پیشِ نگہ
اس قرب پہ آنکھوں میں سمانا معلوم

دبیر

کھانے کا مزا فقط زبانی نکلا   باقی سامانِ عیش فانی نکلا
چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دبیرؔ   اتنا بھی نہ اس کنوئیں میں پانی نکلا

ناسخ

کیا اوج دو روزہ ہے، تو کیا گاتا ہے   پھر سوئے حضیض آسمان لاتا ہے
تنکا جو ہوا سے اڑ کے ہوتا ہے بلند   آخر وہ زمین پر ضرور آتا ہے

انیس

کیا حال کہیں دل کی پریشانی کا   کھانے کی نہ لذت نہ مزا پانی کا
مر رہئے کسی دشت کے دامن میں انیسؔ   پردہ ہے یہی جامۂ عریانی کا

ایضاً

کیا سوچ کے اس دارِ فنا میں آئے   آفت میں پھنسے دامِ بلا میں آئے
اس طرح عدم سے آئے دنیا میں انیسؔ   جیسے کوئی کارواں سرا میں آئے

مہر

کیا سمجھے ہیں یاں یہ جان جو دیتے ہیں   کیوں زیست حباب وار کھو دیتے ہیں
دنیا سے ہے مہرؔ اس کنارہ بہتر   اس بحر میں آشنا ڈبو دیتے ہیں

دبیر

گر صبح یہاں آوج ہے تو شام نہیں   جب عزل ہوا مہر نہیں نام نہیں
سرعت سے تری نبضِ مریضانہ گردوں   دنیا کو ترے ہاتھ سے آرام نہیں

مومن

گردش میں ہیں خاص و عام کیا دور ہے یہ
صہبائے طرب حرام کیا دور ہے یہ
جو بزمِ نشاط ہے جہاں میں سو خراب
یکجا نہیں دورِ جام کیا دور ہے یہ

داغ

لبریز ہے حسرتوں سے میرا سینا
ہر روز مجھے خون جگر کا پینا
کرتا ہوں دعا، یا الٰہی اب تو
منظور نہیں ہے اس طرح کا جینا

انیس

مجموعۂ خاطر اندنوں ابتر ہے
جو رگ ہے بدن پر رشتۂ مسطر ہے
معنی سے بھرا ہوا ہے دل شکلِ کتاب
کیا غم ہے جو تن مثلِ قلم لاغر ہے

عشق

معمورِ غم و درد و الم سینا ہے
مرنا جسے سمجھتے تھے وہ اب جینا ہے
کیا خاک نظر آئے خوشی کی صورت
دل عشق کا ٹوٹا ہوا آئینہ ہے

انیس

وہ بخت کدھر ہیں اور کہاں تاج ہیں وہ
جو اوج پہ تھے زیرِ زمیں آج ہیں وہ
قرآن لکھ لکھ کے وقف جو کرتے تھے
اک سورۂ الحمد کے محتاج ہیں وہ

ایضاً

ویراں ہے کوئی گھر کہیں آبادی ہے
راحت سے کوئی اور کوئی فریادی ہے
اک عشرت و غم کا ہے مرقع دنیا
ماتم ہے کسی جا تو کہیں شادی ہے

انیس

ہر آن تغیری ہے زمانہ کے لئے انسان کا دل ہے داغ اٹھانے کیلئے
بوڑھا ہو کہ نوجواں غنی ہو کہ فقیر سب آئے ہیں اس خاک میں جانے کیلئے

سیسر

ہر صبح غموں میں شام کی ہے، ہمنے خونتابہ کشی مدام کی ہے، ہمنے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر مرمر کے غرض تمام کی ہے ہمنے

ایضاً

ہر صبح مرے سر پہ قیامت گذری ہر شام نئی ایک مصیبت گذری
پامالِ کدورت ہی رہا یاں دن رات یوں خاک میں ملتے ہمکو مدت گذری

دبیر

یوں دانے بھی آسیا میں کم پستے ہیں اب اہلِ زمیں جیسے بہم پستے ہیں
اک سنگِ فلک، دوسرا ہے سنگِ زمیں دانوں کی طرح بیچ میں ہم پستے ہیں

شوربختی

داغ

میں رطب کو دیکھوں تو وہ یابس ہو جائے　　پرکھوں زرِ خالص کو اگر مس ہو جائے
ہاتھوں میں مرے آکے درم داغ بنے　　قاروں بھی مرے سائے سے مفلس ہو جائے

انیس

ڈھونڈھوں تو نہ صورتِ بحالی نکلے　　کیا دردِ غم سے طبعِ عالی نکلے
سو بار بھروں تو شوربخت ایسا ہوں　　دریا سے مرا جام بھی خالی نکلے

ایضاً

کس طرح نہ تلخ زندگانی ہو جائے　　پتھر یہ جو گر پڑیں تو پانی ہو جائے
اس دم جو شریکِ درد ہووے مرا　　خورشید کا رنگ آسمانی ہو جائے

بے خوابی

غالب

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب　　دل رک رک کے بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں　　سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

میر

دل جن کے بجا ہیں انکو آتی ہے خواب　　آرام خوش آتا ہے سہاتی ہے خواب
میں غمزدہ کیا اپنے دنوں کو روؤں　　میر ہی تو جہاں شب ہوئی جاتی ہے خواب

عمر گذشتہ

اوج

اے ذوقِ سخن پیام کہدینا تو — ہے آخری اک کلام کہدینا تو
مل جائے اگر شبابِ رفتہ — ٹھہرا کے مرا سلام کہدینا تو

غالب

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال — ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہونچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم — اے عمر گذشتہ یک قدم استقبال

اوج

بے برگ و نوا ہے ساتھ پیچھے پیچھے — مشتاقِ لقا ہے ساتھ پیچھے پیچھے
اے عمرِ رواں اپنی سواری ٹھہرا — اک آبلہ پا ہے ساتھ پیچھے پیچھے

جوانی و پشیمانی

انیس

جب اٹھ گیا سایۂ جوانی سر سے — پھر ہو گی جدا نہ سرگرانی سر سے
کچھ ہو گا نہ ہاتھ پاؤں مارے سے انیس — جس وقت گذر جائے گا پانی سر سے

رشید

کیوں جا کے سوئے عالمِ فانی آتی — مغرور اگر تھی، نہ جوانی آتی
کہتا جب میں ذرا دکھا دے صورت! — اے کاش صدائے لن ترانی آتی!

پیری

انیس

اب زیرِ قدم لحد کا باب آپہونچا — ہشیار ہو جلد وقتِ خواب آپہونچا
پیری کی بھی دوپہر ڈھلی آہ انیس — ہنگامِ غروبِ آفتاب آپہونچا

حالی

اب ضعف کے پنجہ سے نکلنا معلوم — پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جسکا پانا ہے محال — آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

اکبر

افسوس سفید ہو گئے بال ترے — لیکن ہیں سیاہ اب بھی اعمال ترے
تو زلفِ بتاں بنا ہوا ہے اب تک — دنیا پہ ہنوز پڑتے ہیں جال ترے

مونس

افسوس کہ شمعِ عیش خاموش ہوئی — راحت سب عیش کی فراموش ہوئی
تنہا ہم ہی اک سوگ جوانی میں نہیں — پیری بھی خضاب سے سیہ پوش ہوئی

ظفر

اک وقت تھا کہ لوٹتے تھے واشت و دو کے — پھر یہ ہوا کہ گزرنے لگے کھیل کود کے
اب حال یہ ہے عالمِ پیری میں اے ظفر — باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے

میر

اوقات جوانی کے گئے عشرت میں ایام لڑکپن کے گئے غفلت میں
پیری میں بجز افسوس کیا کیا جائے یکبارہ کمی ہی آگئی طاقت میں

رشید

ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہو گا کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا
کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری پیری کہتی ہے کہ خواب دیکھا ہوگا

انیس

بالوں پہ غبار شیب ظاہر اب ہے ہشیار انیس تو مسافر اب ہے
پیدا ہے سپیدی وسحر پیری کی اب خواب سے چونک رات آخر اب ہے

میر

بس حرص وہوا سے سیر اب تم جاگو غفلت کب تک رہے ہماری لاگو
چلنے کی خبر ہے یہ سفیدی مُو کی ہونے آئی ہے صبح، اب تو جاگو

اوج

پختہ امید خام ہونے آئی عمر ہستی تمام ہونے آئی
خواب غفلت سے تو نہ چونکا اے اوج صبح پیری کی شام ہونے آئی

انیس

پیری آئی عذار بے نور ہوئے یاران شباب پاس سے دور ہوئے
لازم ہے کفن کی یاد ہر وقت انیس جو مشک سے بال تھے وہ کافور ہوئے

اوج

پھر ہونگے نہ بیدار وہ خواب آئیگا
پوچھو گے ہزار نہ اک جواب آئیگا
آئیگی نہ پھر گئی جوانی اے اوج
آئی ہوئی پیری کا شباب آئیگا

درد

پیری آچلی گئی جوانی اپنی
اے درد کہاں ہے زندگانی اپنی
کل کوئی بیاں اور کریگا اس کو
کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی

اکبر

پیری آئی، ہوئی جوانی رخصت
ساتھ اسکے وہ لطفِ زندگانی رخصت
ہے اب تو اسی کا انتظار اے اکبر
ہم کو بھی کرے جہانِ فانی رخصت

انیس

پیری سے بدن زار ہوا زاری کر
دنیا سے انیس اب تو بیزاری کر
کہتے ہیں زبانِ حال سے موئے سپید
ہے صبح اجل کوچ کی طیاری کر

رشید

پیری سے بھی خاک مہربانی نہ ہوئی
وقتِ آخر بھی کامرانی نہ ہوئی
یوں توڑتا دم کہ دیکھنے آتے لوگ
افسوس کہ اس وقت جوانی نہ ہوئی

ایضاً

پیری وہ ہے کہ جس کا مارا ہوں میں
اے بھائیو مہمان تمہارا ہوں میں
چھپ جاؤں نظر سے، ہے وہ ہنگام قریب
وقت اور ہے اب صبح کا تارا ہوں میں

رشید

پیری میں خمیدہ کر دیا ہے تو نے ظالم کیسا ستم کیا ہے تو نے
سیدھا ہونے دے اب تو اے پیرِ فلک اپنا سا مجھے بنا لیا ہے تو نے

اوج

تمہیدِ فراقِ جسم و جاں ہے پیری تقریبِ وصالِ رفتگاں ہے پیری
گذری شبِ عشرتِ جوانی اے اوج بجھتی ہوئی شمع کا دھواں ہے پیری

ذوق

جن دانتوں سے ہنستے تھے ہمیشہ کھل کھل اب درد سے ہیں وہی رلاتے ہل ہل
پیری میں کہاں اب وہ جوانی کے مزے اے ذوق بڑھاپے سے ہے دانتا کل کل

انیس

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
آکے جو نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا جا کے جو نہ آئے وہ جوانی دیکھی

ایضاً

راتیں نہ وہ اب ہونگی نہ خواب آئیگا آیا بھی تو زیست کا جواب آئیگا
اٹھو اب انتظار کیا ہے انیس عمر پھر گئی، نہ شباب آئیگا

امیر

رو دے کوئی کیا، گئی جوانی کیونکر جاتی ہے نسیم و گل کی نکہت ہوکر
پیری آندھی سی امیر ناگہ آئی ہم برگِ خزاں سے اس میں ٹھہریں کیونکر

میر

زانو پہ قدم خم شدہ سر کو لایا جائے دنداں کو ہم نے خالی پایا
آنکھوں کی بصارت میں تفاوت آیا پیری نے عجب سماں ہمیں دکھلایا

حالی

کی طاعتِ نفس میں عبث عمر بسر انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اٹھا چکے اب حالی مجلس کرو برخاست، ہوا وقتِ سحر

عشق

کیا روح تنِ زار میں گھبراتی ہے تاریکیٔ مدفن ہمیں یاد آتی ہے
ہے آمدِ پیری سے طبیعت محزوں ہوتی ہے سحر شمع بجھی جاتی ہے

دبیر

گردش سے مہ و مہر کی، یہ روشن ہے زائل ہر دم بقائے جان و تن ہے
ہشیار کہ پیری سے ہوئے بال سپید اس روز کی شب، سیاہیٔ مدفن ہے

اوج

ہر چند کہ نفسِ مطمئن باقی ہے، لیکن نہ وہ دل ہے نہ وہ سن باقی ہے
بالوں کی سیاہی پہ سفیدی آئی راتیں تو کٹیں ہجر کی دن باقی ہے

ایضاً

ہستی کی بندھی کمر کھلی جاتی ہے راہِ عدم آباد ملی جاتی ہے
اے اوج جدھر گیا شباب مرحوم پیری بھی اسی طرف چلی جاتی ہے

انیس

ہشیار کہ وقتِ سازو برگ آیا ہے ہنگامِ یخ و برف و تگرگ آیا ہے
محتاجِ عصا ہوئے تو پیری نے کہا چلئے اب چوبدارِ مرگ آیا ہے

عشق

ہے سجدہ گہِ مرگ جنابِ پیری کرتا ہے یہاں خاک میں خواب پیری
رخصت ہوئی وہ جب ہوئی اسکی آمد ہے بڑھکے جوانی سے شبابِ پیری

دبیر

ہے شمعِ شباب گل تو یہ روشن ہے نزدیک بس اب وداعِ جان و تن ہے
ہشیار کہ پیری سے ہوئے بال سپید اس روز کی شب سیاہئی مدفن ہے

مومن

ہے عہدِ شباب میں زندگانی کا مزا پیری میں کہاں وہ نوجوانی کا مزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مزا

عشق

ہیں ضعف سے بیکار قدم جاتے ہیں سر پر ہے اجل سوئے عدم جاتے ہیں
مدت ہوئی اے عشق جوانی سے چھٹے پیری بھی یہ کہتی ہے کہ ہم جاتے ہیں

انیس

یہ عمر یوں ہی تمام ہو جائے گی مرنے کی خبر بھی عام ہو جائے گی
روتے ہو انیس کیا جوانی کے لئے پیری کی سحر بھی شام ہو جائے گی

تعبیرِ خوابِ ہستی

جرأت

آخر ہمیں ایک دن گنوا آویں گے — کام اور جہاں کے لوگ کیا آویں گے
جو از رہِ دوستی ملا کرتے ہیں آج — کل کو وہی خاک میں ملا آویں گے

تسلیم

آخر ہے بہارِ زندگانی فانی — نیرنگِ شباب و نوجوانی فانی
جُھرّی یہ نہیں صفحۂ رُخ پر تسلیم — لکھا قلمِ قضا نے فانی! فانی!!

انیس

آغوشِ لحد میں جبکہ سونا ہوگا — جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیسؔ — ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا

ایضاً

اب خواب سے چونک، وقتِ بیداری ہے — لے زادِ سفر کوچ کی طیاری ہے
مر مر کے پہونچتے ہیں مسافر واں تک — یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

ایضاً

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے — ناداں! تجھے فکر آب و دانے کی ہے
ہستی کے لئے ضرور اکدن ہے فنا — آنا ترا دلیل جانے کی ہے

انیس

اتنا نہ غرور کر، کہ مرنا ہے تجھے، آرام ابھی قبر میں کرنا ہے تجھے
رکھ خاک پہ تو سوچ کے پاؤں کو انیسؔ اک روز صراط سے گذرنا ہے تجھے

مونس

اُس ملک سے دنیا کی ہوس میں آئے اب جائیں کدھر اجل کے بس میں آئے
مر کر نکلے تو کنج مرقد دیکھا جب دام سے چھوٹے تو قفس میں آئے

ایضاً

افسوس کہ پہلے سے نہ ہشیار ہوئے آرام لحد کے نہ طلب گار ہوئے
ہنگامِ اجل آنکھ کھُلی غفلت سے جب سونے کا وقت آیا تو بیدار ہوئے

دبیر

اک دن پیوندِ خاک ہونا ہو گا تنہا تنہا لحد میں سونا ہو گا
اس قبر کے پردے کا کھُلا حال دبیرؔ جو اوڑھنا ہو گا وہ بچھونا ہو گا

انیس

اک روز جہاں سے جان کھونا ہو گا گھر چھوڑ کے زیرِ خاک سونا ہو گا
بالش سے سروکار نہ بستر سے غرض اپنا کسی تکیہ میں بچھونا ہو گا

ظہیر

ان آنکھوں سے ہم نے اک زمانہ دیکھا مسجد دیکھی، شراب خانہ دیکھا
طفلی و جوانی و شباب و پیری سب کچھ دیکھا مگر فسانہ دیکھا

انیس

اندیشۂ باطل، سحر و شام کیا عقبیٰ کا نہ ہائے کچھ سرانجام کیا
ناکام چلے جہان سے صد افسوس کس کام کو یاں آئے تھے کیا کام کیا

میر

اندیشۂ مرگ سے ہے سینہ سب ریش ٹکڑے ہے جگر جیسے لباسِ درویش
ہاتھوں سے جو آج ہو سکے کر لیجے پھر کل تو ہمیں ہے ایک قیامت درپیش

دبیر

بالائے زمیں زندوں کی تعمیریں ہیں مُردوں کی بزیرِ خاک جاگیریں ہیں
عبرت کے مرقع کا ہے اک صفحہ زمیں دونوں طرف اس ورق پہ تصویریں ہیں

انیس

جب دارِ فنا سے جان کھونا ہوگا میت پہ عجب طرح کا رونا ہوگا
عادت نہیں سونے ڈھانپ کے سونے کی انیس کیا گذرے گی جب قبر میں سونا ہوگا

ایضاً

جس دم نزدیک وقتِ رحلت ہوگا یارو کیا ہی مقامِ حیرت ہوگا
کوئی عملِ نیک نہ ہوگا جز یاس آخر کو وہی رفیقِ تربت ہوگا

ایضاً

جس دن کہ فراق روح و تن میں ہوگا مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رختِ نو پہن کر غافل اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

انیس

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے
جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب
غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے؟

مجروح

جو نخل ہو خشک اُسکا پھلنا کیا ہے
دنیا ہی نہیں تو کارِ دنیا کیا ہے
پیدا ہوا اگر کوئی تو ناپید کوئی
ہوتا دن رات یہ تماشا کیا ہے

انیس

جینے سے طبیعت تو ہٹی جاتی ہے
غفلت ہی میں اوقات کٹی جاتی ہے
یہ بے خبری! ہزار افسوس انیسؔ
بڑھتے ہیں گناہ، عمر گھٹی جاتی ہے

ایضاً

چھٹتا ہے مقام کوچ کرتا ہوں میں
فرقت اے زندگی کہ مرتا ہوں میں
اللہ سے لو لگی ہوئی ہے میری
اوپر کے دم اسواسطے بھرتا ہوں میں

ایضاً

خاموشی میں یاں لذتِ گویائی ہے
آنکھیں جو ہیں بند، عینِ بینائی ہے
نہ دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد
مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

سیر

درپیش ہے سفر راہ تجھکو پیارے
غفلت سے نہیں نگاہ تجھکو پیارے
آتے ہیں نظر جاتے ہیں سارے اسباب
سوجھے گی کبھو بھی راہ تجھکو پیارے

انیس

دردو الم ممات کیوں کر گذرے یہ چند دم حیات کیوں کر گذرے
مرنے کا تو دن گذر گیا، شکر انیسؔ اب دیکھیں لحد کی رات کیوں کر گذرے

مونس

دل خاک لگے عجیب ویرانہ ہے وحشت نہ ہو کس طرح، سیہ خانہ ہے
ہمراہ تھے احباب لحد تک مونسؔ اب کوئی نہ اپنا ہے، نہ بیگانہ ہے

دبیر

دم سینہ سے الوداع کہہ جائے گا سیلابِ فنا سے تن بھی بہ جائے گا
اس مزرعہ ماتم میں گرا دانۂ اشک بو تخم نکوئی کہ یہ رہ جائے گا

ظہیر

دنیا سے ہر اک کو دل لگاتے دیکھا ہر قصر و چمن میں آتے جاتے دیکھا
ہے زیرِ زمیں عجب سرائے دلچسپ جو یہاں سے گیا اُسے نہ آتے دیکھا

ذوق

دنیا کے الم ذوقؔ اٹھا جائیں گے ہم کیا کہیں کیا آئے تھے، کیا جائیں گے
جب آئے تھے، روتے ہوئے آئے تھے اب جائیں گے اوروں کو رولا جائیں گے

دبیر

دولت کا نکھیا رنج اگر قوت ملے سب خاک ہے ڈھیلے کہ یا قوت ملے
کیا جانئے بعدِ مرگ اپنا کفِ خاک برباد ہوا میں ہو کہ تابوت ملے

صبا

سرسبز ہوا کبھی نہ باغِ ہستی — سرجوش رہا دورِ ایاغِ ہستی
چلنے جو لگے ہجومِ غم کے جھونکے — خاموش ہوا صبا چراغِ ہستی

انیس

سینے میں یہ دم مثلِ سحر گاہی ہے — جو ہے اس کارواں میں وہ راہی ہے
پیچھے کبھی قافلہ سے رہتا نہ انیس — اے عمرِ دراز تیری کوتاہی ہے

ایضاً

طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے — ہستی کو حبابِ آب دیکھا ہم نے
جب آنکھ ہوئی بند تو عقدہ یہ کھلا — جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

میر

کچھ خواب سی ہے میر یہ صحبت داری — اٹھ جائیں گے یہ بیٹھے ہوئے یکباری
کیا آنکھوں کو کھولا ہے تنک گوش کو کھول — افسانہ ہے پل مارتے مجلس ساری

انیس

کچھ عقل کی میزان میں تولا نہ گیا — چپ ہو گئے اس طرح کہ بولا نہ گیا
عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیس — یہ بندِ اجل کسی سے کھولا نہ گیا

ضمیر

کسی کا کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے — کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر — کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

دبیر

گو خورد و کلاں رتبے میں ہیں پست و بلند — ہیں دستِ اجل میں انگلیوں کی مانند
کیا کودک و پیر کیا گدا، کیا سلطاں — اک دامنِ خاک کے یہ سب ہیں پیوند

انیس

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے — دولت نہ گئی ساتھ، نہ اطفال گئے
پہونچا کے لحد تک پھر آئے سب لوگ — ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

ایضاً

گر لاکھ برس جیئے تو پھر مرنا ہے — پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیّا کر لے — غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

درد

مدت تئیں باغ و بوستاں کو دیکھا — یعنی کہ بہار اور خزاں کو دیکھا
جوں آئینہ کب تلک پریشاں نظری — اب مونْد لے آنکھ، بس جہاں کو دیکھا

مونس

مہماں چمنِ دہر میں اک دم ہیں ہم — غنچہ یہ غنیمت ہے کہ باہم ہیں ہم
بیجا ہے کسی گل کی محبت مونس — یاں پا بہ رکاب مثلِ شبنم ہیں ہم

انیس

وہ موجِ حوادث کا تھپیڑا نہ رہا — کشتی وہ ہوئی غرق، وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی کے انیس — جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

دبیر

ہر سر کا عجب یاں سر و ساماں دیکھا اقبال اور ادبار کو یکساں دیکھا
دنیا کے خیال میں جو کیں آنکھیں بند ہم نے تو فقط خواب پریشاں دیکھا

جرأت

ہستی گویا ہے اک مسافر خانا ہر روز ہے قافلوں کا آنا جانا
رنجیدہ کسیکو یاں نہ رکھ اپنے سے پھر جا کے نہیں ہے اس سرا میں آنا

عشق

ہمراہ جنازے کے تھے جو آئے ہوئے سب اپنے گھروں کو گئے گھبرائے ہوئے
کوئی نہ رہا عشق سوائے حسرت کچھ پھول پڑے رہگئے مرجھائے ہوئے

جرأت

ہے جان، سو اسکو ایک دن کھونا ہے جب جسم رہا تو اس سے کیا ہونا ہے
جو خوابِ عدم میں ہیں ترکھا دنیہ قدم آخر اس نیند میں تجکو بھی سونا ہے

ظہیر

ہے مثلِ حباب زندگانی تھوڑی اور درد و الم سے شادمانی تھوڑی
کیں دیدۂ غور سے نگاہیں جو ظہیر جھگڑے ہیں بہت اور کہانی تھوڑی

دبیر

یاں خانہ بدوش چرخِ پیر آیا ہے مہمان ہر اک شاہ و فقیر آیا ہے
شاہا یہ مقام ہے کہ درپیش ہے کوچ جانے کو یہ قافلہ دبیر آیا ہے

یادِ رفتگاں

انیس

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے اس باغ سے کیا کیا گُلِ رعنا نہ گئے
تھا کونسا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں وہ کون سے گُل کِھلے جو مرجھا نہ گئے!

عشق

کس باغ میں یہ سروِ رواں جاتے ہیں کس بزم میں یہ سحر بیاں جاتے ہیں
ملتی ہے خبر کچھ نہ پیام آتا ہے کیوں عشقؔ یہ احباب کہاں جاتے ہیں

دبیر

یارانِ گذشتہ کی خبر خاک نہیں ایسے ہی گئے کہ اب اثر خاک نہیں
چُن چُن کے کیا خاک ہنرمندوں کو اے چرخ تجھے قدرِ ہنر خاک نہیں

انشا

گذری دنیا میں خیر جیسے گذری ہر طرح یہ غم میں ایسے تیسے گذری
پردہاں کی خبر ملی نہ کچھ آج تلک بیچارے مسافروں پہ کیسے گذری

عشق

ہمراہی احباب سے موںھ موڑ گئے آنکھوں سے نہاں ہو گئے دل توڑ گئے
اے عشقؔ ملے خاک میں کیا کیا ہمسن ساتھ آئے تھے جنکے وہ ہمیں چھوڑ گئے

غم عزیزاں

مونس

افسوس دلا انیس مغفور نہیں — آنکھیں جو لہو روئیں تو کچھ دور نہیں
تارے بھی ہیں، خورشید بھی ہے، ماہ بھی ہے — آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور نہیں

حالی

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی — وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب انہی کو بزم یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

اوج

صد حیف کہ خلاق معانی نہ رہا — افسوس مذاق خوش بیانی نہ رہا
اے اوج عبث ہے زندگی بعد دبیر — واللہ کہ لطف زندگانی نہ رہا

حالی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبک طناز — آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبل زار — سو اسکی بھی کل سے نہیں آتی آواز

عشق

ہے نظم کے جوہر کا خزینہ خالی — گویا جگر و دل سے ہے سینہ خالی
اے عشق نہیں ہیں جو انیس اور دبیر — ہے شمس و قمر سے یہ مہینہ خالی

بر وفات غالب، شیفتہ، آزردہ، صہبائی وغیرہ

سلسلہ نمبر ۶

داستان رنگین

شعلۂ عشق

میر

آبِ حیواں نہیں گوارا ہمکو — کس گھاٹ محبت نے اتارا ہمکو
دریا دریا تھا شوقِ بوسہ لیکن — جاں بخشِ لبِ یار نے مارا ہمکو

ناسخ

آتا نہیں پاس جس پہ ہم مرتے ہیں — فرقت ہی میں زندگی کے دن بھرتے ہیں
ہوتا جو وصال کیوں یہ ہوتا سودا — لڑکے ہمیں سنگسار کیوں کرتے ہیں

غالب

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال — ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی — لڑکوں کیلئے گیا ہے کیا کھیل نکال

جرأت

آرام نہیں ہے بیقراری سے ہمیں — اب کام پڑا ہے آہ و زاری سے ہمیں
دل پہ ہے ہاتھ اور آنکھوں میں اشک — حاصل یہ ہوا تیری یاری سے ہمیں

درد

آرام نہ دن کو بیقراری کے سبب — نے رات کو چین آہ و زاری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو — یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

ذوق

آنکھ اُس کی نشہ میں جب گلابی ہو جائے　صوفی اُسے دیکھے تو شرابی ہو جائے
دکھلائے جو وہ رُوئے کتابی اے ذوقؔ　سب مدرسہ کافرِ کتابی ہو جائے

امیر مینائی

آنکھوں سے ہے رنگِ مے پرستی پیدا　پلکوں سے ہے شانِ پیش دستی پیدا
کچھ حاجتِ مے نہیں کہ ہے آپ سے آپ　ان پتلیوں سے سیاہ مستی پیدا

میر

آئی نہ کبھی رسم تلطف تم کو　کرتے نہ سنا ہم پہ تاسف تم کو
مرتے ہم ہیں اور منہ چھپاتے ہو تم　ہم سے اب تک بھی ہے تکلف تم کو

امیر مینائی

آتی ہے شبِ ہجر رلانے کے لئے　میں ایک نہیں سب کے مٹانے کیلئے
اشکوں میں مرے ڈوب رہا ہے عالم　آنکھیں مری روتی ہیں زمانے کیلئے

مومن

اب ہم پہ جو ہر گھڑی وہ جھنجلاتے ہیں　الطاف قدیم آہ یاد آتے ہیں
تھا یا تو وہ لطف یا یہ نفرت اللہ!　لوگ ایسے بھی دنیا میں بدل جاتے ہیں

انشا

اپنی بھی نظر میں سب کی نگاہیں ہونگی　ہاں تم ہو رقیب اور یہ راہیں ہیں گی
کہتے جو بہت ہو تجھکو میں چاہوں ہوں　منہ پر کی میاں یہ ساری باتیں ہیں گی

جرأت

اُس شوخ کا اس طرف گذارا نہوا   اک بار ہوا، ولے دوبارا نہوا
جرأت کریں کیا بیاں اس کا افسوس   ہم اُس کے ہوئے، پر وہ ہمارا نہوا

نظیر اکبر آبادی

اُس زلف نے ہمسے لیکے دل بستہ کیا   ابرو نے کجی کے ڈھب کو پیوستہ کیا
آنکھوں نے، نگہ نے، اور مژہ نے کیا کیا   کیفی کیا، دیوانہ کیا، خستہ کیا

میر

افسوس ہے! عمر ہم نے یونہی کھوئی   دل جس کو دیا اُن نے نہ کی دلجوئی
جھنجھلا کے گلا چھری سے کاٹا آخر   جہل ایسی بھی عشق میں کرے ہے کوئی

سودا

افسوس! ہماری عمر روتے گذری   نت دل سے غبارِ غم ہی دھوتے گذری
دیکھا نہ کبھی خواب میں اپنا یوسف   ہر چند تمام عمر سوتے گذری

میر

اندوہ کھپے عشق کے سارے دل میں   اب درد لگا رہتا ہے ہمارے دل میں
کچھ حال نہیں رہا ہے دل میں اپنے   کیا جانیے وہ کیا ہے تمہارے دل میں

نسیم دہلوی

انساں کا جو کذب پر شعار آتا ہے   خاطر پہ ہر ایک کے غبار آتا ہے
پر وعدۂ یار کچھ عجب شے ہے نسیم   گر جھوٹ بھی ہو تو اعتبار آتا ہے

حاتم

ان سیم بروں کے ساتھ سونا معلوم — قسمت میں لکھا ہے خاک ہونا معلوم!
حاتم افسوس بادے و امروز گذشت — فردا کی رہی امید، سونا معلوم

مجروح

اوروں کو تو دنیا میں قضا نے مارا — وہی زیست خدا نے پھر خدا نے مارا
بر صورت مرگ و زیست اپنی ہے جدا — اُس لب نے جلایا تھا ادا نے مارا

امیر مینائی

ایسا ہوں میں باوفا جو ہوں کشتۂ ناز — ہڈی سے بنے شانہ پس سوز و گداز
وہ شانہ یقیں ہے ہمہ تن ہو کے زباں — دے روز دعا کہ عمر گیسو ہو دراز

ناسخ

اے نالۂ شبگیر نہیں ہوتی صبح — اے اشک کی تاثیر نہیں ہوتی صبح
گذری اک عمر یہ شب تار فراق — مثل شب تصویر نہیں ہوتی صبح

[illegible]

[illegible] اس بے سروپا کی تو کیا — کچھ نہیں [illegible] وفا کی خواہش
[illegible] چلے جی ابھی تن کی [illegible] — معلوم نہیں کیا ہے خدا کی خواہش

انشا

[illegible] ہوا ہے [illegible] کا خیال — [illegible] ہے [illegible] ہی خیال
[illegible] کہیں [illegible] — دل کا ہے ان دنوں عجب احوال

نسیم دہلوی

تن آتش عشق سے بے جلائے نہ رہوں　　سینہ کو کباب بے بنائے نہ رہوں
وہ لذت عشق میں نے چکھی ہے نسیم　　سو دل ہوں تو یار بے لگائے نہ رہوں

انشا

تھیں جس کیلئے وہ جھلیں تھیں تس کیلئے　　ویسا پھر کون ہو کہ ہوں جس کے لئے
آرام و شکیب و صبر و طاقت گئے سب　　روؤں پیٹوں بھلا میں کس کس کے لئے

درد

جان تو اک جہان رکھتا ہے　　کون میری سی جان رکھتا ہے
تیرے بد ڈھنگ اور تجھ سے میاں!　　درد کیا کیا گمان رکھتا ہے

میر

جس وقت شروع یہ حکایت ہوگی　　رنجیدگی یک دگر نہایت ہوگی
احوال وفا کا اپنی ہرگز مجھ سے　　مت پوچھ کہ کہنے میں شکایت ہوگی

سودا

چاہی تھی بتوں کی آشنائی ہم نے　　پر عقل کی بات نہ رہنمائی ہم نے
اس دل کے کنارے سے پیارے یارو　　کچھ آگ لگی تھی سو بجھائی ہم نے

کچھ کام نہ نکلا کبھی زور و زر سے ہم سے　　کیا صورتیں دشمن عجب ہیں کچھ ہم سے
آخر کو تڑپتے رہتے جب دل ہوتا ہے　　اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

امیر مینائی

خط یار نے کیا نام خدا لکھا ہے القاب جدا شوق جدا لکھا ہے
ملجائے یقیں ہے مرضِ غم سے نجات نامہ نہیں تعویذِ شفا لکھا ہے

میر

دل خوں ہے جگر داغ ہے رخسارہ ہے زرد حسرت سے گلے لگنے کی چھاتی میں درد
تنہائی و بیکسی و صحرا گردی آنکھوں میں تمام آب منہ پر سب گرد

غالب

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

مجروح

دم بھر نہیں چین آہ و زاری یہ ہے کھلتی نہیں آنکھ اشکباری یہ ہے
جان جائے تو جائے میں نہ جاؤنگی کبھی ہم سے تو قرارِ بیقراری یہ ہے

منیر

دنیا میں بڑا روگ جو ہے الفت ہے دق آ گئے ہیں جی سے بھی یہ زحمت ہے
کہتے تھے کہ میر ہیچ نا ہم کو نہ جان کی خوب وفا ہیں بھی ہمدرد حمت ہے

جرأت

دیکھا جو کل اس نے میرے جی کا کھونا اور کھینچنے آہ سرد ہر دم رونا
منہ پھیر کے مسکرا کے چپکے سے کہا آسان نہیں کسی پہ عاشق ہونا

نظیر اکبر آبادی

رکھتے ہیں جو ہم چاہ تمہاری دل میں　　آرام کی ہے امیدواری دل میں
تم حکم قرار کو نہ دو گے جب تک　　البتہ رہے گی بیقراری دل میں

ایضاً

رکھتی ہے جو خوش چاہ تمہاری ہمکو　　اور کرتی ہے شاد یاری باری ہمکو
کچھ دیر جو کی تھی ہم نے دل دیتے وقت　　اب تک ہے اسی کی شرمساری ہمکو

رند

رند آپ کو تباہ کیوں کر نہ کرے　　ایسے دلبر کی چاہ کیوں کر نہ کرے
کہتے ہیں یہ لوگ ٹھنڈی سانسیں نہ بھرو　　جب درد ہو دل میں آہ کیوں کر نہ کرے

امیر مینائی

زیبا ہے جو دم بھرتے ہیں مردم اُس کا　　قتال زمانہ ہے تکلم اُس کا
کیا تیغ دو دم ہے اسکی تحریک دولب　　کیا نیمچہ ہے نیم تبسم اُس کا

نظیر اکبر آبادی

ساقی سے جو ہم نے مے کا ایک جام پیا　　پیتے ہی نشے کا یہ سر انجام کیا
معلوم نہیں کہ جھک گئے یا بیٹھے رہے　　یا گر پڑے یا کسی نے پھر تھام لیا

سودا

سرمایۂ عیش کامرانی تو ہے　　آرام دل و مونس جانی تو ہے
گر تو ہی نہ آوے تو یہ جینا کس کام　　سیری تو مرا و زندگانی تو ہے

غالب

شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرنم تھا

انشا

شب نعش پہ پروانے کی گریاں تھی شمع اور آتش فرقت میں فسردہ جاں تھی شمع
اتنے میں ٹپک کے سر سے تاج زریں دیکھا تو ستی ہو گئی، بیجاں تھی شمع

امیر مینائی

ظاہر میں جو آزردہ تمہیں پاتا ہوں کچھ دل میں نہیں، دل کو یہ سمجھاتا ہوں
ہوتا ہے کبھی اگلی محبت کا اثر سچ کہدو، کبھی میں تمہیں یاد آتا ہوں

درد

عاشق ہوئے جس کے اُسکے محبوب بنے دل خواہ اُس کے ساتھ اسلوب بنے
تس پر بھی جو کچھ بنی سو دیکھی تم نے بس درد خدا سے اب تمہیں خوب بنے

انشا

غم نے ترے ایکدم نہ دل خوش چھوڑا تھا صبر جو یار آنے بھی منہ موڑا
جلتا ہے عجب طپش سے اس سینہ میں اللہ! یہ دل ہے یا کہ پکّا پھوڑا

شہیدی

قایل ہوئے اک صنم کے وہ بھی نہ ملا مایل ہوئے اک صنم کے وہ بھی نہ ملا
ہم تجھ سے تمام عمر میں اے اللہ! سایل ہوئے اک صنم کے وہ بھی نہ ملا

ظفر

کاٹتے دن ہیں جو ہم باعثِ غم گن گن کے   شب بھی کرتے ہیں بسر تاروں کو ہم گن گن کے
کوئے جاناں کی زمیں اپنے پکڑتی ہے پاؤں   ہم ظفر اس لئے رکھتے ہیں قدم گن گن کے

میر

کاہیکو کوئی خراب خواری ہوتا   کاہیکو ہمیں یہ جان بھاری ہوتا
دلخواہ ملاپ اس سے ہوتا تو ملتے   اے کاش! کہ عشق اختیاری ہوتا

جرأت

کب درد سے دل کے رنگِ رو زرد نہیں   کس وقت زباں پہ دمِ سرد نہیں
سنتا نہیں کوئی بیکسی میں اس بن   کس سے کہیں درد کوئی ہمدرد نہیں

شہیدی

کب میں نے پیا ساغرِ جمشید سے آب   شرمندہ رہے تشنہ جاوید سے آب
سیراب ہوں جس قدر بڑھے تشنہ لبی   اے عشق پلا چشمۂ خورشید سے آب

درد

کچھ آپ ہی گرا کے آپ ہی کچھ چنتا ہے   کہتا ہے کچھ آپ آپ ہی سنتا ہے
اے درد ہمیشہ یہ دلِ دیوانہ   کیا کچھ ادھیڑتا ہے اور بنتا ہے

جرأت

کچھ عشق میں تجھ مزا نہ پایا ہم نے   اک دل ہی کو مفت میں گنوایا ہم نے
اور جس کے لئے گنوایا اے جرأت   اس کو اپنا کبھی نہ پایا ہم نے

امیر مینائی

کہتے ہو کہ دل کوئی اٹھا لے ہم سے   تم نے تو نئے رنگ نکالے ہم سے
پچتاؤ گے آخر کو کہے دیتے ہیں ہم   دنیا میں کہاں چاہنے والے ہم سے

غالب

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں   عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا   کیوں کر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

رند

کیوں کر تری تصویر مٹاؤں دل سے   کس طور سے یہ نقش اُٹھاؤں دل سے
وہ لطف و عنایت، وہ تلطف، وہ کرم   کن کن تری باتوں کو بھلاؤں دل سے

نصیر

کی کوہ کنی تو زور کس نے دیکھا   اور قیس کا بن میں شور کس نے دیکھا
کرنا ہی ہے کریں گے اُن کے در پر   جنگل میں جو ناچا مور کس نے دیکھا؟

میر

گذرا یہ کہ شکوہ شکایت کیجے   یا آگے سخن اور حکایت کیجے
خوب! اتنی تو اب مجھ پہ رعایت کیجے   دل پھیرا میرے تئیں عنایت کیجے

سودا

گر یار کے سامنے میں رویا تو کیا   مژگاں میں جو لخت دل پرویا تو کیا
یہ دانۂ اشک سبز ہونا معلوم   اس شور زمیں میں تخم بویا تو کیا

نظیر اکبر آبادی

گو یار سے ہر روز ملاقات نہیں   اور ہو بھی گئی تو پھر مدارات نہیں
دل دے چکے اب قدر ہو یا بیقدری   جو کچھ ہو سو ہو بس کی کچھ بات نہیں

جرأت

گہ آتشِ غم سے یوں جلایا ہم کو   گہ جائے سرشک خوں رلایا ہم کو
کیا کہئیے نہ پوچھ ہم سے جرأت احوال   جو جو اس عشق نے دکھایا ہم کو

انشا

لازم یہ ادا و ناز سہنا ہی نہ تھا   اور اُسکی طرف دیکھ کے رہنا ہی نہ تھا
اظہار کیا کہ چاہتے ہیں تجکو   کہ بیٹھے ہم اُس سے، جو کہنا ہی نہ تھا

امیر مینائی

مٹ جاؤں گا غم میں جان کھوتے کھوتے   اس بزم میں ہو گا کوچ ہوتے ہوتے
ہے شمع صفت اگر یہی سوزشِ دل   گھل جائیگا تن تمام روتے روتے

جرأت

مجنوں بھی پھرا دشت میں ہو آوارا   فرہاد بھی سر پھوڑ موا بیچارا
اس عشق کا انجام یہ دیکھا جرأت   اپنا سا ہر ایک نے بہت سر مارا

ایضاً

مجھسے جو ہو سے ہو تم یہ اسرار ہے کیا   دل آپ کا بھی کہیں گرفتار ہے کیا
بیٹھے بیٹھے کراہ اُٹھنے کا سبب   بیمار تو میں ہوں تمکو آزار ہے کیا

مجروح

محبوب جہاں تم کو کہا جاتا ہے
حق کا کلمہ زباں پہ آجاتا ہے
کیا جان کو میری یہ بنا اور رقیب
غش دیکھتے ہی تمکو جو آجاتا ہے

میر

محشر میں اگر یہ آتشیں دم ہوگا
ہنگامہ سب اک لپیٹ میں برہم ہوگا
تکلیف بہشت کاش مجکو نہ کریں
ورنہ وہ باغ بھی جہنم ہوگا

مومن

محروم حصول مدعا نے چاہا
حسرت زدہ بخت نارسا نے چاہا
مومن اُس بت نے گر نہ چاہا نہ سہی
ہم خوش ہیں اسی میں جو خدا نے چاہا

حالی

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے
جب یاد مجھے کریں گے تب روئیں گے
الفت پہ وفا پہ جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روتے تھے تو اب روئیں گے

ذوق

مشکل ہے یہاں پائے خرد کا جمنا
اس وحشی رم دیدہ کو کیسا رسنا
ہم لے رہ عشق و عشق اپنا ہادی
جو عشق کہے ذوق! کہو سلمنا!

میر

ملنا دلخواہ اب خیال اپنا ہے
جی تن میں رہا ہے سو وبال اپنا ہے
آزار بہت کھینچے ہیں اُس بن دل نے
ہجراں ہے شاید کہ وصال اپنا ہے

مومن

مومن اب تب و تاب غم میں ہونے سے حصول پھل پا چکے مفت جان کھونے سے حصول
یہ تخم کہیں ہوا ہے سرسبز سواب اس دانۂ سوختہ کے بونے سے حصول

انشا

میں کوچۂ عشق کی جو کرتا ہوں سیر آرام سے اور اس سے تو ذاتی ہے بیر
ہر لحظہ مری زباں پہ جاری انشاؔ ربِّ یسّر ہے اور تمم بالخیر

مومن

میں شمع نہیں، مرے رلانے سے حصول لوبان نہیں، مرے جلانے سے حصول
میں خوردۂ گل نہ آب باراں ظالم مرے خاک میں ملانے سے حصول

نظیر اکبر آبادی

ناصح نہ سنا! سخن مجھے جس تس کے جو تو نے کہا یہ آوے جی میں کس کے
کیوں کر نہ ملوں بھلا جی میں اُس سے آہ دل رہ نہ سکے بغیر دیکھے جس کے

میر

وصف اپنے دلوں کے کس سے کہیے سارے اُس شوخ کی تمکیں نے تو جی ہی مارے
بالوں میں چھپا منہ نہ کبھو یوں پوچھا کہ میرؔ کٹی ہے رات کیوں کر بارے

ایضاً

وہ عہد گیا کہ جور اُس کے سہیے وہ بات نہیں رہی کہ چپکے رہیے
جب جی ہی چلا گیا تو صرفہ کیا ہے پھر فہ جو کچھ کہ منہ میں آئے کہیے

میر

ہجراں میں کیا سب نے کنارا آخر
اسباب گیا جینے کا سارا آخر
بے تابی رہی نہ صبر و یارا آخر
آخر کو ہوا کام ہمارا آخر

ایضاً

ہر چند کہ اسے یہ اب تمامی ہے گی
پر ہم جو گلہ کریں تو خامی ہے گی
بندے ہیں ترے کیوں کہ کریں سرتابی
منظور تو ہی ہمیں غلامی ہے گی

نظیر اکبر آبادی

ہم اُس کی جفا سے دل میں ہو کر دلگیر
رک بیٹھے تو ہیں دلے کریں کیا تقریر
دل ہاتھ سے جاتا ہے بغیر اُس سے ملے
اب جو پڑیں پاؤں تو پھر کیا تدبیر

جرأت

ہم سے تو بتوں کی کج ادائی نہ گئی
بو مہر کی اُن میں کچھ بھی پائی نہ گئی
سو ٹکڑے کیا شیشۂ دل کو لیکن
ان سنگدلوں سے بیوفائی نہ گئی

ناسخ

ہے خالق اصباح سے امید مجھے
دے گا نہ غم فرقت جاوید مجھے
مانند سحر کروں گریباں صد چاک
شاید نظر آجائے وہ خورشید مجھے

جرأت

ہے غم سے یہ عنقریب اب دم نہ رہے
گھر آکے قریب میرے ہمدم نہ رہے
جی شدت غم سے چل بسا تن سے آہ!
لو درد و الم تم ہی رہو ہم نہ رہے

درد

ہے کون کسی کا؟ کیا کس سے کہنا　　اپنا اپنا ہر ایک کا ہے لہنا
گذرے ہے اب اسطرح سے اپنی اے درد　　رونا چپکے پڑے اکیلے رہنا

میر

ہیں گو کہ سبھی تمھاری پیاری باتیں　　پر جی سے نہ جائیں گی تمھاری باتیں
آنکھیں ہیں ادھر روئے سخن اور طرف　　یاروں کی نظر میں ہیں یہ ساری باتیں

درد

یا اُس نے ہی کچھ رسم تغافل کم کی　　تاثیر بڑھی ہے یا کہ اپنے غم کی
رونے کو مرے تولے ہے وہ نظروں میں　　اس گوہر اشک کی بھی رتی چمکی

میر

یک مرتبہ دل پہ اضطرابی آئی　　یعنی کہ اجل میری شتابی آئی
بکھراجاتا ہے ناتوانی سے جی　　عاشق نہ ہوئے کہ اک خرابی آئی

درد

یوں دیکھ کے اپنے غم میں مجکو رنجور　　کہتا ہے سمجھ تو سہی گر کچھ ہے شعور
اتنا بھی نہ مر تو کوئی دن جیتا رہ　　ملنا ہے تجھے پھر بھی جو مجھ سے منظور

تصویر

داغ

تم تو فلکِ حسن پہ ہو ماہ منیر سایہ کی طرح ساتھ ہے داغ دلگیر
خالِ لبِ گلفام ہے شاہد اس کا بے داغ نہ کھنچ سکی تمہاری تصویر

دل لیکے مکرتی ہے تمہاری تصویر یہ بات تو کرتی ہے تمہاری تصویر
خاموش جو ہو جاتی ہے اس کے آگے کیا داغ سے ڈرتی ہے تمہاری تصویر

گو لاکھ کرے ناز تمہاری تصویر میری تو ہے دمساز تمہاری تصویر
کہدیتی ہے سب بھید تمہارا مجھسے لو بن گئی غماز تمہاری تصویر

ہر عیب سے خالی ہے تمہاری تصویر دنیا سے نرالی ہے تمہاری تصویر
کس شکل مصور سے یہ پوری کھنچتی دل کھینچنے والی ہے تمہاری تصویر